Sept
2023

ماہنامہ

پیام عرفات

رائے بریلی

آہنی عزم کی ضرورت

’’سارا گلہ اور سارا شکوہ اسی بات کا ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمانوں نے ابھی اچھی طرح سے سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ نہیں کیا کہ ہم ہر چیز کی قربانی کے لیے تیار ہیں، ایمان وعقیدہ کی قربانی کے لیے تیار نہیں۔ اس آدھی رات کو جس میں دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جس میں جھوٹ بولنے والا بھی جھوٹ بولنے سے ڈرتا اور پناہ مانگتا ہے، میں خدا کی قسم! کھا کر کہتا ہوں کہ جس دن آپ نے یہ فیصلہ کیا کہ آپ کو ایمان سب سے بڑھ کر عزیز ہے، ایمان کے بغیر بچوں کا جینا بھی آپ کو مطلوب نہیں، اسی وقت سے حالات میں تبدیلی آجائے گی اور مشکلات کے پہاڑ (اگر وہ مشکلات خیالی نہیں بلکہ واقعی ہیں) اپنی جگہ سے ہٹ جائیں گے۔‘‘ (خطبہ صدارت دینی تعلیمی کونسل ۱۹۸۲ء، صفحہ: ۷)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

مرکز الإمام أبی الحسن الندوي
دارِ عرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

صبر کا مفہوم

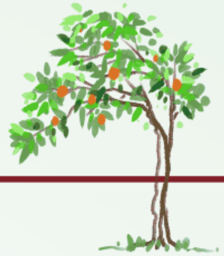

مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

''تم نے اپنی بدبختی سے نہ صرف شریعت کے حکم کو بدلا ہے بلکہ اپنے طریق عمل سے شریعت کے لفظوں کو بولیوں کو بھی بدل ڈالا ہے۔ ''صبر'' کے معنی کیا ہیں؟ تم سمجھتے ہو کہ صبر کے معنی ہیں؛ بے غیرتی اور باطل کی پرستش اور پوجا۔ تم صبر کے یہ معنی سمجھتے ہو لیکن جو شخص صبر کے یہ معنی سمجھتا ہے اس سے بڑھ کر قرآن مجید کی تحریفِ لفظی کرنے والا کوئی نہیں۔ تحریفِ معنوی تو بہت سے علماء کر رہے ہیں، لیکن تحریف لفظی یہ ہے کہ اگر صبر کے معنی یہ ہیں کہ تمہارے حق کے مقابلہ میں مصیبت آجائے تو تم کو چاہیے کہ صبر کے گوشے میں پناہ لو یعنی ہر طرح کی بے غیرتی کو، بے چارگی کو، باطل پرستی کو قبول کر لو۔ تو میرے بھائیو! تم سے بڑھ کر قرآن کی تعلیم کو بدلنے والا کوئی نہیں۔

''صبر'' کے معنی اس سے بالکل مختلف ہیں۔ صبر کے معنی ہیں؛ برداشت کے۔ صبر کے معنی ہیں؛ جھیلنے کے۔ صبر کے معنی ہیں؛ تحمل کے۔ جو قدم تم مقصد کی راہ میں اپنے محبوب اور پیارے مقصد کے لیے اٹھاؤ اور اس میں طرح طرح کی مصیبتیں آئیں، طرح طرح کی ڈراؤنی صورتیں آئیں، زنجیریں اور ہتھکڑیاں آئیں، بلکہ ممکن ہے کہ تمہارے سامنے تختہ آوے اور اس پر ایک پھندا جھول رہا ہو۔ یہ سب تمہارے سامنے آسکتا ہے لیکن اگر تم حق کے پرستار ہو تو تمہارا فرض ہونا چاہیے کہ تمہارے اندر صبر ہو۔ تمہارے اندر برداشت کی وہ اٹل طاقت، برداشت کا وہ پہاڑ موجود ہو جس پر دنیا کی کوئی شوکت، کوئی تاج و تخت فتح یاب نہ ہو سکے۔ یہ معنی صبر کے ہیں۔ چنانچہ قرآن مجید کے مواقعِ استعمال پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر جگہ صبر کے یہی معنی ہیں۔''

(خطباتِ آزاد: ۵۹-۶۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اردو اور ہندی میں شائع ہونے والا

ماہنامہ

پیامِ عرفات

رائے بریلی

مرکز الامام أبی الحسن الندوی دارعرفات تکیہ کلاں رائے بریلی (یوپی)

جلد: ۱۵ — صفر المظفر ۱۴۴۵ - ستمبر ۲۰۲۳ء — شمارہ: ۹

مجلس ادارت

بلال عبدالحی حسنی ندوی

مفتی راشد حسین ندوی

عبدالسبحان ناخدا ندوی

محمد حسن ندوی

معاون ادارت

محمد نفیس خاں ندوی

محمد ارمغان بدایونی ندوی

ایمان کیا ہے؟

قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

”اَلْإِيمَانُ أَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهِ وَبِلِقَائِهِ وَرُسُلِهِ وَتُؤْمِنَ بِالْبَعْثِ.“

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

(ایمان کی تعریف یہ ہے کہ تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان لاؤ اور اس کے فرشتوں کے وجود پر اور اس کی ملاقات کے برحق ہونے پر اور اس کے رسولوں کے برحق ہونے پر اور مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنے پر۔)

(صحیح البخاری: ۵۰)

پرنٹر پبلشر محمد حسن ندوی نے ایس، اے، آفسٹ پرنٹرس، مسجد کے پیچھے، پھاٹک عبداللہ خاں، سبزی منڈی، اسٹیشن روڈ، رائے بریلی سے طبع کرا کر دفتر ”پیام عرفات“ مرکز الامام أبی الحسن الندوي، دارِعرفات، تکیہ کلاں رائے بریلی سے شائع کیا۔

www.abulhasanalinadwi.org

فی شمارہ: -/Rs.15

E-Mail: markazulimam@gmail.com

سالانہ زرتعاون: -/Rs.150

Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi Samiti (Punjab National Bank) A/c No. 6127002100000339 (IFSC: PUNB0612700)

فہرس

ملک کی بگڑتی صورت حال (اداریہ)........................... ۳
بلال عبدالحی حسنی ندوی..

ذرائع ومقاصد کی ہم آہنگی - وقت کی ایک اہم ضرورت........ ۴
حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ.........................

دینی دعوت کے رہنما اصول.. ۶
حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندویؒ..............................

تقویٰ کیا ہے؟... ۸
بلال عبدالحی حسنی ندوی..

نکاح کے چند مسائل.. ۱۰
مفتی راشد حسین ندوی..

مشرکین کے مطالبات اور قرآنی اعلان.......................... ۱۲
عبدالسبحان ناخداندوی...

صحابہ کرامؓ کی محبت... ۱۴
مولانا محمود حسن حسنی ندویؒ...

چند لمحے سلفِ صالحین کی صحبت میں........................... ۱۶
محمد امین حسنی ندوی...

مولانا علی میاںؒ بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ...... ۱۷
محمد ارمغان بدایونی ندوی...

صحابہ (رضی اللہ عنہم) کی بزرگی

نتیجۂ فکر:- سید عبدالرب صوفی رحمۃ اللہ علیہ

صحابہ میں رسول پاک کی صحبت کی تاثیریں
یُعَلِّمُهُمُ کی **تشریحیں** یُزَکِّيهِمُ کی تفسیریں

کلام اللہ کے مثل اعتبار ان کا مسلم ہے
وہ عادل ہیں تو ناطق ہیں کلام حق کی تحریریں

کرام ان کو کہا اللہ نے، بررة کہا ان کو
ملائک کو بھی ان القاب کی شامل ہیں تفسیریں

نبی کو بھاگئی خود اپنی جس کھیتی کی شادابی
اسی قرآن میں محفوظ ہیں سب اس کی تعبیریں

نبی نور خدا ہیں گو نہیں اس نور کا ٹکڑا
صحابہ ہیں نبی کے نور کی پرنور تنویریں

جلال ان کا جمال پاک حق بن کر پکار اٹھا
محمد کی غلامی سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

خود ان کی آنکھ ٹیڑھی ہے جسے ٹیڑھی نظر آئیں
رسول پاک کے دست مبارک کی یہ تعمیریں

صحابہ نے نبی پر اس طرح جانیں فدا کی ہیں
کہ مٹ سکتی نہیں اب مَنْ قَضٰي نَحْبَهٗ کی تحریریں

لیے پھرتے تھے یوں حق کے لیے جانیں ہتھیلی پر
کھنچی ہیں صفحہ مَنْ يَنْتَظِرُ پر اب بھی تصویریں

زمین قدس میں خون شہادت یوں سمویا ہے
صحابہ کا لہو ٹپکے اگر ذروں کا دل چیریں

وہی ہے دین حق، ہم اور صحابہ جس پہ قائم ہیں
یہ ہوتی تھیں رسول پاک کی پر کیف تقریریں

فلاح دو جہاں ہے پیروی قوم صحابہ کی
عبث ہے کیجیے اس کے سوا گو لاکھ تدبیریں

صحابہ پر اگر شک ہے تو اپنے ہاتھ میں صوفی
نمازیں ہیں دعائیں ہیں اذانیں ہیں نہ تکبیریں

بلال عبدالحی حسنی ندوی

ملک کی بگڑتی صورت حال

اس ملک کی خصوصیت یہ رہی ہے کہ یہ مختلف مذاہب اور تہذیبوں کا مرکز رہا ہے، ہر ایک کو پھلنے پھولنے کے مواقع یہاں حاصل ہوئے ہیں، آزادی کی لڑائی ہندوؤں نے مسلمانوں کے ساتھ مل کر لڑی ہے اور واقعہ یہ ہے کہ ملک میں جنگ آزادی کا صور پھونکنے والے مسلمان ہی تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز دہلویؒ نے سب سے پہلے اس کا فتویٰ دیا اور حضرت سید احمد شہید رائے بریلویؒ نے سب سے پہلے عملی اقدام کیا۔ ریشمی رومال کی تحریک ہو یا شاملی کے میدان کی جاں بازیاں، اس کی قیادت کرنے والے علماء ومشائخ تھے۔ گاندھی جی کو گوشۂ تنہائی سے نکال کر قیادت کے منصب پر مولانا محمد علی جوہرؒ نے بٹھایا۔ ملک کی آزادی کی یہ ایک پوری تاریخ ہے، لیکن برطانیہ نے اپنا سامراج لپیٹتے لپیٹتے بھی اپنی ایسی بدنما یادگاریں چھوڑیں جنھوں نے ملک کی شبیہ داغدار کردی۔ ملک کی سنسکرتی اور روایات کو گندہ کر گئے۔ ایک انگریز مصنف اس کا اعتراف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ ہم نے ایسی تاریخ تیار کردی ہے کہ ہندو اور مسلمان کبھی مل نہیں سکتے۔ اس کا سب سے پہلا مظاہرہ تقسیم ملک کے موقع پر بہت ہی گھناؤنی شکل میں ہوا، عورتوں اور بچوں کو زندہ کھولتے ہوئے تیل میں ڈال دیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ یہ سب ان لوگوں نے کیا جنھوں نے مل کر ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دی تھیں اور اس کے لیے لاکھوں نہیں کروڑوں جانیں نذر ہوئی تھیں۔

اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ ملک میں ایسی گھناؤنی ذہنیت رکھنے والا طبقہ نہ صرف یہ کہ موجود ہے بلکہ پنپ رہا ہے اور یہ چیز ملک کی سالمیت کے لیے بہت بڑا خطرہ بنتی جارہی ہے کہ اس طبقہ کی ہمت افزائی ان لوگوں کی طرف سے ہورہی ہے جو لوگ ملک کی سالمیت کے ذمہ دار سمجھے جاتے ہیں۔ ملک کو آزاد ہوئے صرف ۷۷/سال کا عرصہ گزرا ہے لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ وہ دوبارہ غلامی کی طرف جارہا ہے۔ ملک کا اعلیٰ دماغ دوسروں کے کاز کے لیے استعمال ہورہا ہے۔ سات سات سمندر پار سے یہاں کی پالیسیاں طے کی جارہی ہیں اور اس قوم سے اس سلسلہ میں مشورے کیے جارہے ہیں جس نے اس ملک کو تباہ کرنے کی قسم کھا رکھی ہے۔ یہودی پروٹوکول میں یہ حقائق موجود ہیں۔ کیا اس سے اس ملک کے لیے کسی بھلائی کی امید کی جاسکتی ہے جس نے ہمیشہ انسانیت کا خون پیا ہے؟ یہ صورت حال ملک کے لیے بے حد خطرناک ہے!!

ملک کے باشندوں کو مساویانہ شہری حقوق حاصل ہیں۔ یہاں کے قانون میں کوئی بھید بھاؤ نہیں ہے لیکن جس طرح یہاں کی سب سے بڑی اقلیت کے ساتھ برتاؤ کیا جارہا ہے اور خاص طور پر الکٹرانک میڈیا یہاں کا ذہن مسموم کرتا رہا ہے۔ یہ یہاں کی پوری فضا کو زہر آلود کردینے کے لیے کافی ہے پھر مسئلہ صرف ایک قوم کا نہیں رہ جائے گا پورا ملک خطرہ میں پڑ جائے گا، کسی بھی ملک کے لیے یہ نہایت خطرناک صورت حال ہے کہ وہاں کی آبادی حصوں میں تقسیم ہوجائے اور محاذ آرائی شروع ہوجائے پھر ملک کی ساری صلاحیتیں ضائع ہونے لگتی ہیں اور ترقی کے راستے بند ہوجاتے ہیں۔

ملک کے حکمراں طبقہ کی جو صرف تجارتی ذہن نہ رکھتا ہو بلکہ ملک کی خیر خواہی بھی اس کے دماغ کے نہاں خانہ میں موجود ہو یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ ملک کو بچانا ان کا اولین فریضہ ہے پھر ان کو آزادانہ ذہن اور کھلے دماغ کے ساتھ سوچنے کی ضرورت ہے۔ اس ملک کے پاس بڑا دماغ موجود ہے، لوگوں کے اندر غور کرنے اور نتائج تک پہنچنے کی صلاحیت موجود ہے، اس کو استعمال کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر دوسروں کے دماغ سے سوچا گیا تو یہ غلامی کی بدترین شکل ہے جو ملک کو تباہی کے غار میں دھکیل دے گی!!

ضرورت ہے کہ ملک کو ترقی کے راستہ پر چلنے دیا جائے۔ اس ملک میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ ''سپر پاور'' بن کر ابھرے لیکن جب اندرون ہی کمزوریاں پیدا کی جانے لگیں گی تو کوئی دوسرا اس کو طاقت نہیں پہنچا سکتا!!

ذرائع ومقاصد کی ہم آہنگی—وقت کی ایک اہم ضرورت

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

یہ دور ذرائع کی ترقی کا دور ہے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے جو سائنس کے براہِ راست اسٹوڈنٹ نہیں ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ ہمارا یہ دور ذرائع کی پیداوار (Production) کا ہے۔ اس دور کے بہت سے نام رکھے جاسکتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ فولاد کا دور ہے، کوئی کہتا ہے ایٹمک انرجی کا دور ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جو چیز سب کو Cover کرتی ہے وہ یہ کہ یہ دور ہے ذرائع کی ترقی کا۔ اس میں ایٹمک انرجی بھی آجاتی ہے، اس میں لوہا اور فولاد بھی آجاتا ہے، اس میں سائنس اور ٹیکنالوجی بھی آجاتی ہے تو زیادہ سے زیادہ جو چیز Cover کرسکتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ دور ہے ذرائع کی ترقی کا، انسٹرومینٹ (Instruments) کی ترقی کا، ٹیکنالوجی کی ترقی کا اور Means کی ترقی کا دور ہے، یہی دیکھئے کل تک ہم جلسہ کو Address کرتے تھے تو بہت زور سے ہم کو بولنا پڑتا تھا، آواز کسی کو پہنچتی تھی، کسی کو نہیں پہنچتی تھی، اب یہ خدا کی کتنی بڑی دین ہے اور سائنس کا کتنا بڑا Contribution ہے حالانکہ بہت ہی معمولی، بہت ہی حقیر اور بہت ہی چھوٹا سا Contribution مائک کی صورت میں ہمارے آپ کے سامنے ہے مگر یہ بھی بڑی نعمت ہے۔ میں آسانی کے ساتھ آپ سے بات کر رہا ہوں اور اگر اس سے دس گنا مجمع ہوتا تو میری آواز آسانی کے ساتھ وہاں تک پہنچتی۔ ایک روشنی کو دیکھ لیجیے کہ موم بتیاں جلائی جاتی تھیں پھر بہت ترقی کی تو لالٹینوں کا زمانہ آیا پھر اور ترقی ہوئی تو گیسوں کا زمانہ آیا مگر اب ایک سوئچ دبایا تو یہ سب کا سب ہال جگمگا اٹھا۔ یہ سب ذرائع ہیں۔

یہ سب ذرائع خدا کی نعمت ہیں۔ کوئی مذہبی انسان جو شخص Extremist ہو، جو بالکل پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہو، وہ بھی ان ذرائع کو ٹھکرا نہیں سکتا اور ان کی تحقیر نہیں کرسکتا، ان کو Deny نہیں کرسکتا، ذرائع اللہ کی نعمت ہیں۔ ہمارے مذہبی آدمی جو مذہبی طریقہ پر سوچتے ہیں۔ Religious Thinking ہے، Religious Mentality ہے وہ بھی اس کو مانتے ہیں اور ہماری مذہبی کتابیں، آسمانی صحیفے، ان میں سے قرآن شریف کا میں نے کچھ زیادہ مطالعہ کیا ہے۔ اس میں خدا نے جگہ جگہ اپنے بندوں پر احسان رکھا ہے جو کچھ دنیا میں ہے وہ سب میں نے تمہارے لیے ہی پیدا کیا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾ (البقرة: ٢٩)

(وہ ہے جس نے سب تمہارے لیے ہی پیدا کیا ہے۔)

وہ سب تمہارے Disposal میں دے دیا ہے، تمہارے ہاتھ اور تمہاری مٹھی میں دے دیا ہے اور وہ کہتا ہے:

﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾

(ہم نے انسان کی عزت وعظمت بڑھائی خشکی اور تری پر اس کو سوار کردیا۔)

ہم نے زمین کو بھی اس کی سواری بنایا، ہوا اور فضا اور سمندر کو بھی اس کو سواری بنایا۔ میں سمجھتا ہوں جو دوسری مذہبی کتابیں ہیں ان سب میں ذرائع کو، Means کو، آلات اور خدا نے جو چیزیں پیدا کی ہیں وہ خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اب یہی دیکھئے کہ فاصلے کیسے سمٹ گئے ہیں؟ میں لکھنؤ سے آپ کے یہاں آیا ہوں، یہی فاصلہ شاید ایک مہینے میں طے ہوتا، کتنی بڑی نعمت ہے کہ ریل پر، ہوائی جہاز پر، کار پر کوئی آدمی بیٹھے اور اس سواری کے حساب سے آدمی مہینوں کی منزل ہفتوں میں اور ہفتوں کی منزل دنوں میں اور دنوں کی منزل گھنٹوں میں طے کرسکتا ہے، یہ سب خدا کی نعمتیں ہیں۔

اب میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ یہ نعمتیں، یہ ذرائع، یہ Means، یہ Instruments خود کافی نہیں ہیں، ان کی جو قدر و قیمت، ان کی جو Merit، ان کی جو افادیت ہے وہ سب مقاصد پر منحصر ہے کہ ان سے کیا کام لیا جاتا ہے؟ اگر ہمیں یہ نہ معلوم ہو کہ ہم ان سے کیا کام لے سکتے ہیں تو یہ ہمارا منھ دیکھتے رہ جائیں گے اور ہم ان کا منھ دیکھتے رہ جائیں گے۔ کوئی فائدہ نہیں اٹھائیں گے اور اگر ہم ان سے کوئی غلط کام لیں تو یہ بھی ان کی ناقدری ہوئی اور گویا ہم نے ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا۔

آج کی دنیا کا سانحہ (Tragedy) یہ ہے کہ ذرائع میں تو برابر ترقی ہو رہی ہے اور ہر روز نت نئے وسائل و ذرائع کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم خود ذرائع کے متوالے ہو رہے ہیں، ہم پر ذرائع کا رعب طاری ہے، ہماری Mentality ایسی ہوگئی ہے کہ ہم یہ سوچتے بھی نہیں کہ مقاصد کی بھی ضرورت اور اہمیت ہے۔ یہ ذرائع ناکافی و نامکمل (Incomplete) ادھورے بلکہ خطرناک ہیں اگر ان کے ساتھ صحیح مقاصد نہ ہوں۔

ہمارا Mental Attitude صحیح نہیں ہے، اگر ہمارے اندر Moral Sense نہیں ہے، اگر ہمارے دل میں انسانیت کا احترام، انسانیت کی عزت، انسان کی عزت، انسان کی محبت، انسانی جان کی قدر و قیمت اور انسان کے بارے میں اعلیٰ تصور نہیں ہے، اگر ہم کوئی انسانی کلچر نہیں رکھتے تو یہ تمام ذرائع اور وسائل بڑے خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں، یہ ایک کھلی حقیقت ہے۔ یہ Common Sense کی بات اور ایک Practical چیز ہے۔

وہ لوگ جو ذرائع میں بہت Advance ہیں، بہت ترقی کر رہے ہیں، جو دنیا کو Lead کر رہے ہیں، انسانیت کی قیادت کر رہے ہیں خود ان کا کیا حال ہے؟ ایک جنگ عظیم ہوئی پھر دوسری جنگ عظیم (Second Great War) ہوئی۔ اب دنیا تیسری جنگ عظیم (Third Great War) کے خطرات سے دوچار ہے جس کے متعلق اندیشہ ہے کہ اگر یہ ہوئی تو پوری نسل انسانی تباہ ہو جائے گی، اس لیے کہ Means ہیں لیکن وہ Aims نہیں ہیں جو کنٹرول کر سکیں اور بریک لگا سکیں۔ یہ تو ایسا ہی ہے کہ کسی ناسمجھ بچہ کے ہاتھ میں بلیڈ یا دیا سلائی دے دی جائے یا کسی ایسے آدمی کو جس کا دماغی توازن بگڑ چکا ہو اور وہ Abnormal ہو، کوئی ایسی نازک چیز دے دی جائے جس سے خطرہ ہو۔

آج دنیا کی یہ حالت ہے کہ اسے سائنس Drive کر رہی ہے اور جو لوگ سائنس، تہذیب، تمدن، کلچر اور سیاست کی قیادت کر رہے ہیں ان میں توازن (Balance) نہیں ہے، ان میں ذرائع کے صحیح استعمال کا احساس و شعور نہیں ہے، انھیں کسی ملک، کسی قوم، کسی شہر، کسی فرد کی تباہی کی پرواہ نہیں، ذرائع اور مقاصد کے عدم توازن کے تباہ کن نتائج ہمارا دن رات کا مشاہدہ ہیں۔

انسانیت کی قسمت، انسانی تہذیب (Civilization)، سوسائٹی کا تحفظ؛ ذرائع اور مقاصد کی ہم آہنگی پر منحصر ہے، ان دونوں میں تعاون (Co-operation) ہو، ایک دوسرے کی خدمت کا جذبہ ہو، ایک دوسرے کو Favour کرے، طاقت پہنچائے، ذرائع آگے بڑھ کر کہیں کہ ہم خدمت کے لیے حاضر ہیں اور مقاصد کے ہاتھ میں اپنی باگ دوڑ دے دیں۔

پھر خدا کا خوف، انسانیت کا احترام، انسانی جان کی قدر و قیمت کا احساس اور یہ شعور ہو کہ ذرائع انسان کے خادم ہیں آقا نہیں، سکھ پہنچانے کے لیے ہیں دکھ پہنچانے کے لیے نہیں، آدمی کے دل میں ایسا جذبہ اور ایک ایسی کیفیت ہونی چاہیے کہ وہ ذرائع کو احساس ذمہ داری کے ساتھ اور بہتر سے بہتر مقاصد کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ ہو۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو یہ سب چیزیں نہ صرف بےکار رہوں گی بلکہ انسان کو تباہ کر دیں گی۔

ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ جب ذرائع نہیں تھے لیکن مقاصد اچھے تھے؛ نیتیں اچھی تھیں، دل اچھے اور پاک تھے، جب دماغ روشن تھے، جب خدا کا خوف غالب تھا، جب انسانوں کو انسانوں سے ہمدردی تھی تو بہت تھوڑے ذرائع میں انسانوں نے وہ کام کیے جو آج تک تاریخ میں نقش ہیں۔

دینی دعوت کے رہنما اصول

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی مدظلہٗ

اسلامی دعوت کا اصول یہ ہے کہ آپ ایسا طریقہ کلام اختیار کریں جس کے بعد انسان یہ کہنے پر مجبور ہوجائے کہ ان کی بات صحیح اور معقول ہے۔ انسان کے انداز کا بہت اثر پڑتا ہے، آپ مخاطب سے جس انداز سے کوئی بات کہیں گے اس پر ویسا ہی اثر پڑے گا۔ اگر آپ مخاطب سے کوئی بات جیتنے کے انداز میں کہیں گے تو اس پر کوئی خاص اثر نہیں ہوگا، لیکن اگر آپ اس سے ہمدردی کے لہجہ میں بات کریں گے اور اس کے لیے اپنے دل میں تڑپ رکھیں گے تو اس پر آپ کی بات کا گہرا اثر پڑے گا۔ حضور ﷺ کا حال یہ تھا کہ آپ لوگوں کے لیے تنہائی میں تڑپتے تھے، یہ سوچتے تھے کہ یہ لوگ جہنم میں جائیں گے، میں ان کو کسی طرح پکڑ کر روک لوں کہ یہ جہنم سے بچ جائیں۔ آپ ﷺ نے اس کی ایک مثال بھی دی کہ ہماری مثال ایسے ہی ہے جیسے آگ جل رہی ہو، لوگ اس میں گرے جارہے ہوں اور ہم ان لوگوں کی کمر پکڑ پکڑ کر اس آگ سے ہٹا رہے ہیں کہ بھائی آگ میں نہ جاؤ۔ گویا آپ ﷺ اس مثال سے امت کو یہ سمجھا رہے ہیں کہ لوگوں کو جب دعوت دی جائے تو دل میں اس قسم کی کڑھن ہونا چاہیے کہ تم دیکھ نہیں رہے ہو آگے گہرا گڑھا ہے، تم اس میں گر جاؤ گے۔ اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ آدمی اپنے لیے نہیں تڑپ رہا ہے بلکہ سامنے والے سے کہہ رہا ہے اور اس کی بھلائی کے لیے کہہ رہا ہے۔ اب وہ اس سے جس انداز میں کہے گا اسی انداز میں ہمدردی ہوگی۔ ظاہر بات ہے اس انداز میں دھمکی نہیں ہے کہ بھائی آگے گڑھا ہے دیکھو گر نہ جانا۔ اگر کوئی یہ انداز اختیار کرے تو سننے والا سمجھ لے گا کہ یہ ہماری ہمدردی میں کہہ رہے ہیں، ہم کو بچانا چاہتے ہیں۔ قرآن میں خطاب کا یہی انداز سکھایا گیا ہے، حضور ﷺ کے کلام کا انداز بھی محبت بھرا تھا، آپ ﷺ جس طرح محبت سے بات کرتے تھے اور جس طرح لوگوں کو متوجہ کرتے تھے، بس دل میں بات اتر جاتی تھی جبکہ اس وقت ایک مشترک سوسائٹی تھی، کچھ لوگ مسلمان ہوگئے تھے اور کچھ مسلمان نہیں ہوئے تھے اور پھر دوسرے لوگ مختلف لوگ تھے، بعض مخالف تھے بعض موافق تھے لیکن آپ ؐ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ سب سے محبت کے ساتھ بات کرتے تھے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جس نے ایک مرتبہ آپ کی بات سن لی اور آپ سے مل لیا وہ یہی کہتا کہ یہ مخالفت والے آدمی نہیں ہیں۔

ہم اور آپ ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں مختلف طبقات کے لوگ آباد ہیں اور مختلف طبیعتوں کے لوگ ہیں۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کا فرق نہ بھی کیا جائے تب بھی یہ بات طے ہے کہ لوگوں کی طبیعتیں الگ الگ ہوتی ہیں، جو جس سوسائٹی کا ہے اسی کے لحاظ سے اس کی طبیعت ہوتی ہے، طبیعت سب کی ایک نہیں ہوتی، لہٰذا اگر ہم ایک طبیعت سمجھ کر کے سب سے بات کریں گے تو اس کا نقصان ہوگا۔ ہر شخص کی طبیعت اس کے ماحول سے بنتی ہے، ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے۔ ہم سب اپنے ماحول کے بنے ہوئے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اسلام ہمارے سامنے رکھا گیا اور ہم نے قبول کرلیا بلکہ ہم سب اپنے ماحول کے اعتبار سے بنے ہوئے ہیں اور اگر آپ ماحول کو تبدیل کریں گے تو جس ماحول کو قبول کریں گے اس کی قدر کرتے ہوئے اس کو قبول کریں گے، لہٰذا آپ ایک ایسا ماحول بنائیں جس میں اس بات پر خاص توجہ دی جائے کہ ہم کو سب سے محبت سے ملنا ہے۔ سب سے ہمدردی سے بات کرنا ہے، سب کو یہ دکھانا ہے کہ ہم تمہارے لیے ایک بھائی کی طرح ہیں۔ ہم تمہارے سچے ہمدرد ہیں، ہم تمہیں چاہتے ہیں کہ تم نقصان سے بچ جاؤ، ہم چاہتے ہیں کہ تم آرام کی زندگی گزارو، تمہیں کسی قسم کی کوئی تکلیف نہ ہو، تم کو پریشانی نہ ہو، اس لیے کہ انسانی زندگی میں پریشانیاں بے شمار ہیں۔ یہ زندگی عجیب وغریب زندگی ہے، اللہ تعالیٰ نے ہم کو یہ زندگی امتحان کے لیے دی ہے، اس لیے اس میں بڑا تنوع ہے، اس میں ہر آدمی کو طرح طرح کے حالات پیش آتے ہیں اور وہ حالات ایسے

ہوتے ہیں جن کا تعلق کسی مذہب سے نہیں بلکہ انسانی زندگی سے ہوتا ہے۔اس دنیا میں جو انسان بھی زندہ ہے تو اس کے ساتھ یہ بات لگی ہوئی ہے کہ پریشانیاں آئیں گی اور ان کو دور کرنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں گی۔اب جو شخص بھی کسی کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرے گا، وہ اس پریشان حال کے نزدیک محبوب ہو جائے گا، لہٰذا اگر آپ کسی پریشان شخص سے ہمدردی سے بات کر لیجیے تو اس کا دل آپ سے خوش ہو جائے گا اور ایسے موقع پر مسئلہ کسی خاص نظریہ یا مذہب کا نہیں ہوتا بلکہ مسئلہ انسانی ہمدردی کا ہوتا ہے، انسانی تعلق کا ہوتا ہے کہ ہم سب انسان ہیں، تو انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے ربط رکھیں۔انسان انسان ہے، جانور نہیں ہے کہ ہم اس کے ساتھ جانور جیسا معاملہ کریں۔ظاہر ہے ہم انسان کے ساتھ انسان جیسا معاملہ کریں گے یعنی بھائی جیسا، ہم اس سے کہیں گے کہ بھائی تم کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے، ہم کو بھی زندہ رہنے کا حق ہے، تم بھی اچھی طرح زندگی گزارو، ہم بھی آرام سے زندگی گزاریں۔

دعوت کی راہ میں مذکورہ انداز دوسرے کو دوست اور اپنا ہمدرد بنانے کا بہترین طریقہ ہے۔اس کا جتنا اثر پڑتا ہے اتنا اثر دلائل سے نہیں پڑتا ہے اور بحث کا بھی اثر نہیں پڑتا ہے بلکہ اس کا الٹا اثر پڑتا ہے۔سالوں قبل ہمارے ملک ہندوستان میں بہت مناظرے ہوتے تھے، خود ہم بھی بعض مناظروں میں شریک ہوئے ہیں اور ہم نے وہاں یہ دیکھا ہے کہ دونوں طرف سے یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہم ہی جیتیں اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دونوں جیتتے ہیں اور دونوں ہارتے ہیں، بسا اوقات ایک دوسرے کو برا کہنے اور غلطی نکالنے تک کی نوبت آجاتی ہے، لیکن اس پروگرام سے کوئی خاطر خواہ حل نہیں نکلتا، اس لیے کہ زور زبردستی سے کسی کو بات منوانا مشکل ہے، بمقابلہ محبت و ہمدردی کے ساتھ پیش آنے کے۔انسان پر محبت و ہمدردی کا جو اثر پڑتا ہے وہ غیر معمولی ہوتا ہے۔اگر کسی اسپتال میں ڈاکٹر ہمدردی کے ساتھ دوا دیتا ہے اور محبت کے ساتھ علاج کرتا ہے تو مریض کا آدھا مرض ختم ہو جاتا ہے، لیکن اگر ڈاکٹر نے صاف صاف جملوں میں بات کی تو مریض کا دل ٹوٹ جاتا ہے، اس کو اگر کل مرنا ہے تو آج ہی مر جائے۔اسی طرح جو شخص مریض کی مدد کرے، مریض کے ساتھ ہمدردی کرے اور اس کو کچھ دے دلائے تو اس عمل سے یقینی طور پر مریض بے حد متاثر ہوگا، اسی طرح جو شخص مصیبت میں ہو، وہ اس بات کے لیے بالکل بے تاب ہو کہ کوئی ہماری مدد کرے، ہماری تکلیف دور کرے، تو اگر اس کا یہ مطالبہ جو کہ دل کا مطالبہ ہے پورا ہو جائے تو بلا شبہ وہ آپ کا گرویدہ ہو جائے گا اور پھر وہ زندگی بھر آپ کو یاد رکھے گا کہ یہ فلاں صاحب ہیں جو مصیبت کے موقع پر ہمارے کام آئے تھے، چاہے کوئی بھی شخص اس کی بات بالکل نہ مانے لیکن ہم اعتراف کریں گے کہ یہ ہمارے فلاں موقع پر کام آئے تھے، جب ہمیں پریشانی تھی تب یہ ہمارے کام آئے تھے، پھر وہ جب بھی آپ سے ملے گا اسی جذبہ سے ملے گا کہ انہوں نے آڑے وقت پر ہماری مدد کی تھی اور مشکل وقت میں ہمارے کام آئے تھے۔

مسلمان کو اللہ تعالیٰ نے ایسے ہی اخلاق کا حکم دیا ہے اور اسی لیے اسلام کا نام "سلم" رکھا ہے، اسلام کے معنی ہیں: اپنے کو اللہ تعالیٰ کے حوالہ کر دینا اور اس کے دوسرے معنی "سِلم" کے بھی ہیں، اس کو اللہ تعالیٰ نے "سِلم" بھی کہا ہے، "سلم" کے معنی امن کے ہیں، یعنی جو مسلمان ہے وہ امن قائم کرنے والا ہے، مسلمان وہ ہے جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا ہے کہ اللہ جو چاہے گا وہ ہم کریں گے، ہم اپنی مرضی سے کچھ نہیں کریں گے، اس کو "اسلام" کہا گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے "مسلمان" نام رکھا ہے۔گویا ہمیں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہم دوسروں کو فائدہ پہنچانے والے ہیں، امن قائم کرنے والے ہیں، دوسروں کی ہمدردی کرنے والے ہیں، صرف یہی نہیں کہ عبادت کر لی اور فارغ ہو گئے، عبادت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے، انسانوں سے نہیں ہے، آپ جب بھی عبادت کریں گے تو وہ عبادت اللہ تعالیٰ کے یہاں قبول ہوگی، لیکن جہاں معاملہ انسانوں سے تعلق کا ہے، وہاں یہ دیکھا جائے گا کہ ان کا معاملہ لوگوں کے ساتھ اچھا ہے یا نہیں؟

تقویٰ کیا ہے؟

بلال عبدالحی حسنی ندوی

اعمال کا دار ومدار:

حدیث میں آتا ہے:

"إنما الأعمال بالنيات وإنما لكل امرئ ما نوى، فمن كانت هجرته إلى دنيا يصيبها أو إلى امرأة ينكحها فهجرته إلى ما هاجر إليه." (صحيح البخاري: ١)

(اعمال کا دار ومدار نیتوں پر موقوف ہے اور ہر عمل کا نتیجہ ہر انسان کو اس کی نیت کے مطابق ہی ملے گا۔ پس جس کی ہجرت دنیا حاصل کرنے کے لیے ہو یا کسی عورت سے شادی کی غرض ہو تو اس کی ہجرت ان ہی چیزوں کے لیے ہوگی جن کے حاصل کرنے کی نیت سے اس نے ہجرت کی ہے۔)

یعنی آدمی کی جیسی نیت ہوگی اللہ اسی کے مطابق اس کو نوازیں گے، یہاں تک کہ حدیث میں ہجرت جیسے عمل کے متعلق بھی فرمادیا گیا کہ اگر آدمی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے کرتا ہے تو یقیناً یہ ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے لیکن اگر اپنے نفس کے لیے ہجرت کرتا ہے، شادی کے لیے ہجرت کرتا ہے، کاروبار کے لیے ہجرت کرتا ہے یا دنیا کے اور مقاصد اس کے سامنے ہیں تو یہ ساری بڑی سے بڑی چیزیں اور بڑے بڑے کام اللہ کے یہاں ان کی کوئی قیمت نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آدمی جہاد بھی اللہ کے لیے نہیں کرتا بلکہ صرف اپنے ملک کے لیے کرتا ہے یا اپنی ذات اور عزت کے لیے کرتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کے یہاں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ جہاد کی قیمت اللہ کے یہاں جب ہے جب آدمی اللہ کو راضی کرنے کے لیے جہاد کرے۔ اللہ کے دین کے لیے جہاد کرے کہ اللہ کا دین بلند ہو، تب حقیقت میں وہ اللہ کے راستہ میں جہاد ہے اور اگر جہاد کا مقصود اپنی جماعت کو بنالیا جائے یا اپنے ادارے مقصود بنالیے جائیں تو یہ بھی خطرناک بات ہے۔ مقصد صرف اللہ کا دین اور اس کی رضا ہونی چاہیے۔ اگر ایسا مزاج بنے گا تو حقیقت میں یہی تقویٰ کا مزاج ہے اور اگر خدانخواستہ ہم نے اپنے اداروں کو مقصود بنایا یا اپنے کاموں کو مقصود بنایا تو ہمیں سمجھنا چاہیے کہ ہم نے ترتیب غلط کردی، اس لیے کہ جو وسائل ہیں ان کو ہم نے مقاصد کا درجہ دے دیا اور جو مقاصد ہیں ان کو وسائل کا درجہ دے دیا اور یہ ایسی الٹی ترتیب ہے جس کے بعد کام بے حقیقت ہوجاتے ہیں۔

مطلوب شے

اللہ کے نزدیک مطلوب شے تقویٰ کی اصل زندگی اور تقویٰ کا مزاج اور دل میں تقویٰ کی کیفیت کا ہونا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے قربانی کے متعلق یہ بات ارشاد فرمائی کہ

﴿لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ﴾ (الحج: ٣٧) (اللہ کو ان کا گوشت اور خون ہرگز نہیں پہنچتا، ہاں اس کو تو تمہارے (دل) کا تقویٰ پہنچتا ہے)

یعنی آدمی جانور کی قربانی کرتا ہے، تو اگر اللہ کے لیے کرتا ہے اور اللہ کی رضا مقصود ہے تو صاف کہہ دیا گیا کہ وہ قربانی اللہ کو پہنچے گی اور اگر قربانی سے مقصود صرف گوشت پوست ہے جیسا کہ قربانی کے موقع پر آج کل تماشے ہوتے ہیں، باقاعدہ مقابلے ہوتے ہیں کہ فلاں نے ایک لاکھ کا بکرا خریدا اور فلاں نے دو لاکھ کا بکرا خریدا پھر اس کی نمائش ہوتی ہے تو یہ ساری چیزیں اللہ کو انتہائی ناپسند ہیں۔

قربانی ایک مثال ہے۔ اسی طرح اگر ہم اپنے دین کے کاموں کی بھی خدانخواستہ نمائش کرتے ہیں اور اللہ کی رضا کے لیے وہ کام نہیں کرتے بلکہ خدانخواستہ اپنی شہرت وعزت کے لیے وہ کام کرتے ہیں تو سچی بات یہ ہے کہ یہ سب محنت بے سود ہے۔

تقویٰ کا حق:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾ (آل عمران: ١٠٢)

(اے ایمان والو! اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو جیسے اس

سے ڈرنا چاہیے اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔)

اس آیت میں اہل ایمان کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ جس طرح اللہ سے ڈرنا چاہیے، اس کا لحاظ ہونا چاہیے، دل کے اندر اس کا تقویٰ ہونا چاہیے اور اعمال میں جس طرح سے تقویٰ کا ظہور ہونا چاہیے، وہ اس کا حق ہے جو ادا کیا جائے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اس میں تقویٰ کے حکم کی بنیاد پر حضرات صحابہؓ نے یہ سمجھا کہ یہ ایک مسلسل اطاعت ہے جس میں کہیں بھی نافرمانی کا شائبہ نہ ہو، بعض حدیثوں میں اس کی طرف اشارہ بھی ہے کہ ایسا تقویٰ تبھی ہوسکتا ہے جب اس میں نافرمانی کا کوئی شائبہ نہ ہو یعنی اللہ کا ایسا شکر ادا کیا جائے جس میں ناشکری کا کوئی شمہ نہ ہو اور آدمی پوری طرح سے اللہ کی بارگاہ میں متوجہ ہو جائے اور ذرا بھی غفلت پیدا نہ ہو۔ بعض احادیث میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ حضرات صحابہؓ کے بارے میں یہ بات آتی ہے کہ اس آیتِ شریفہ کے نزول کے بعد انہوں نے اللہ کی بندگی وعبادت کے لیے اپنی محنت میں ایسا اضافہ کر لیا جس سے بعض مرتبہ لگتا تھا کہ اب ان کی برداشت سے باہر ہو جائے گا۔ بعض صحابہ کے متعلق آتا ہے کہ وہ نمازوں میں کھڑے رہتے تھے یہاں تک کہ ان کے پیروں پر ورم آجاتا تھا، اس کے علاوہ بھی بعضوں نے عبادت میں انتہائی درجہ کا انہماک پیدا کر لیا تھا۔

صحابہ کرامؓ کی خصوصیت:

صحابہ کرامؓ کی ایک خصوصیت تھی کہ انہیں جو حکم ملتا تھا وہ اس میں یہ نہیں دیکھتے تھے کہ اس پر عمل کتنا ہمارے بس میں ہے اور کتنا بس سے باہر ہے، اس لیے کہ وہ جانتے تھے کہ اللہ کی طرف سے حکم آیا ہے اور نبی ﷺ کے ذریعہ سے حکم ملا ہے جو رحمۃ للعالمین ہیں، اس لیے ہمیں اس پر بہر صورت عمل کرنا ہے، اس سلسلہ میں حضرات صحابہ کے متعدد واقعات ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں جہاں حکم دیا گیا اسی لمحہ انہوں نے اس پر عمل کیا مثلاً: ایک مرتبہ آپ ﷺ نے خطبہ کے دوران فرمایا کہ ”جو جہاں موجود ہے وہ وہیں بیٹھ جائے۔“ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اس وقت مسجد میں داخل ہو رہے تھے، جب انہوں نے حضور ﷺ کی یہ آواز سنی تو وہ راستہ ہی میں بیٹھ گئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اٹھ کر آگے آجاؤ وہاں کیوں بیٹھ گئے؟“ انہوں نے فرمایا کہ ”مجھے کہاں زیبا تھا کہ آپ کوئی حکم فرمائیں اور پھر مجھے اس میں سوچنے کا بھی کوئی موقع ہو۔“

اس طرح حضرات صحابہؓ کے نہ جانے کتنے واقعات ہیں۔ ایک مرتبہ ایک صحابی آئے اور وہ سونے کی انگوٹھی پہنے ہوئے تھے۔ آپ ﷺ نے ان کو ٹوکا تو انہوں نے فوراً اتار کر پھینک دی پھر جب آپ ﷺ تشریف لے گئے تو لوگوں نے ان سے کہا کہ اب انگوٹھی اٹھا لو اور اپنے گھر والوں کے استعمال میں لے آنا یعنی تمہاری بیوی یا گھر کے لوگ استعمال کر لیں گے لیکن انہوں نے فرمایا کہ

”حضور ﷺ نے جس چیز کے بارے میں یہ بات کہہ دی کہ یہ جائز نہیں ہے، میں نے اس کو اتار کر پھینک دیا، اب دوبارہ میں اس کو اٹھا لوں یہ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔“

الغرض اس قسم کے نہ جانے کتنے واقعات ہیں۔ اسی لیے ان کے متعلق یہ مشہور ہے ۔

جہاں کردیا گرم گرما گئے وہ
جہاں کردیا نرم نرما گئے وہ

یہ بالکل حقیقت ہے کہ ان کی لگام شریعت کے قبضہ میں تھی۔ ان سے جو کہا جاتا وہ اسی پر عمل کرتے تھے۔ اسی لیے جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ﴾(آل عمران: ۱۰۲)

(اے ایمان والو! اللہ سے اسی طرح ڈرتے رہو جیسے اس سے ڈرنا چاہیے اور نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو۔)

تو صحابہؓ نے اپنے آپ کو مٹا دیا اور کھپا دیا۔ اسی لیے پھر یہ آیت بھی نازل ہوئی کہ

﴿فَاتَّقُوا اللَّهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾(التغابن: ۱۶)

(تو جتنا ہو سکے تقویٰ کو لازم پکڑو۔)

نکاح کے چند مسائل

مفتی راشد حسین ندوی

مہر کے مسائل

جب دس درہم سے کم مہر مقرر کرے:

اگر کسی سامان یا روپے پیسے کو مہر مقرر کیا لیکن اس کی مالیت دس درہم یعنی ۳۱ر گرام چاندی سے کم ہے تو اتنا اضافہ کرنا ضروری ہوگا جس سے ۳۱ر گرام چاندی کے بقدر مالیت ہوجائے۔
(ہدایہ مع الفتح:۳/۲۰۸)

اور اگر عقد کے وقت اتنی رقم مقرر کی جو دس درہم کے بقدر تھی لیکن جب دینے کا قصد کیا تو مالیت دس درہم سے گھٹ گئی ہے تو ایسی صورت میں واجب تو اتنی ہی رقم ہوگی جتنی مقرر کی تھی، خواہ اس کی مالیت دس درہم سے کم ہی کیوں نہ ہوگئی ہو لیکن مناسب یہی ہے کہ شوہر دس درہم کے بقدر کر کے دے۔ (ہندیہ:۱/۳۰۲)

کسی سامان یا جانور کو بطور مہر مقرر کرنا:

کپڑے، زیور یا کسی جانور وغیرہ کو بھی مہر بنایا جاسکتا ہے لیکن شرط یہی ہے کہ ان کی مالیت دس درہم سے کم نہ ہو نیز ان کی جنس متعین کردی ہو۔ اگر جنس متعین نہیں کی مثلاً: کہا کہ کپڑا دیں گے، جانور دیں گے۔ کپڑے کی اور جانور کی جنس نہیں بتائی تو تعیین صحیح نہیں ہوگئی، لہٰذا مہر مثل لازم ہوگا اور اگر جنس بتادی اور صنعت نہیں بتائی مثلاً: کہا کہ بکری دیں گے یا سوتی کپڑا دیں گے تو درمیانی بکری اور درمیانی مالیت کا سوتی کپڑا بھی دے سکتا ہے اور ان کی قیمت بھی دے سکتا ہے۔ (ہدایہ مع الفتح:۳/۳۳۵)

پورا مہر دینا کب واجب ہوتا ہے؟

اگر نکاح کے بعد عورت سے خاص تعلق قائم کرنے کے بعد یا خلوتِ صحیحہ ہونے کے بعد طلاق دے دی یا ان دونوں چیزوں کے بعد یا ان سے پہلے ہی شوہر کا انتقال ہوگیا تو اگر کوئی مہر مقرر کرلیا تھا تو پورا مہر واجب ہوجائے گا اور اگر مہر مقرر نہیں کیا تھا تو مہر مثل واجب ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر کسی نے ایک یا دو طلاقیں دیں پھر عدت کے اندر ہی دوبارہ نکاح کیا تو خواہ دخول اور خلوت کرے یا نہ کرے، پورا مہر واجب ہوجائے گا۔ (شامی:۲/۳۵۸)

اور اگر ان شکلوں میں سے کسی کے پیش آنے سے پہلے طلاق دی تو اگر کوئی مہر مقرر کیا ہے تو اس کا نصف واجب ہوجائے گا اور اگر کوئی مہر مقرر نہیں کیا تھا تو متعہ واجب ہوگا۔ (ہدایہ مع الفتح:۳/۲۱۱)

مہر مثل کیا ہے؟

اوپر بتا چکے ہیں کہ مہر مثل کا مطلب یہ ہے کہ عورت کی بہنوں یا پھوپھیوں یا چچازاد بہنوں کا جو مہر مقرر کیا گیا ہو وہی اس کا مقرر کیا جائے، جب کہ وہ عمر اور حسن و جمال وغیرہ میں اس کے ہم پلہ ہوں۔ اگر اس طرح کے امور میں یہ ان سے بڑھ کر ہو تو اسی اعتبار سے اس کا مہر بڑھا دیا جائے اور اگر ان امور میں ان سے کم مرتبہ کی ہو تو اسی اعتبار سے اس کا مہر گھٹا دیا جائے۔ (شامی:۲/۳۸۴-۳۸۵)

متعہ کیا ہے؟

اوپر بیان کیا گیا کہ اگر کچھ مہر مقرر کیے بغیر نکاح کیا اور خاص تعلق قائم کرنے یا خلوتِ صحیحہ کرنے سے پہلے طلاق دے دی تو متعہ واجب ہوگا۔ متعہ کا مطلب یہ ہے کہ مرد عورت کو ایک جوڑ کپڑا دے۔ اس میں چار چیزیں دینی ہوں گی: (۱) کرتہ (۲) اوڑھنی (۳) پاجامہ (۴) چادر۔ اور یہ ایک جوڑ کپڑے دونوں کی مالی حالت کے اعتبار سے درمیانی قیمت کے دیے جائیں گے۔
(ہندیہ:۱/۳۰۴)

اس عورت کو متعہ دینا چونکہ مہر کی جگہ پر ہے لہٰذا واجب ہے۔ بقیہ تمام مطلقہ عورتوں کو متعہ دینا مستحب ہے یعنی جن کا مہر مقرر کیا ہے، اگر ان کو دخول یا خلوتِ صحیحہ کے بعد طلاق دی ہے تو پورے مہر کا دینا واجب ہے اور متعہ یعنی ایک جوڑ کپڑے دینا مستحب ہے اور اگر دخول اور خلوتِ صحیحہ سے طلاق دی ہے تو جو مہر مقرر کیا ہے اس کا نصف دینا واجب ہے اور متعہ دینا مستحب ہے۔ (ہندیہ:۱/۳۰۴)

متعہ کے لفظی معنی کسی بھی قسم کا فائدہ حاصل کرنے کے ہیں۔ مہر کی جگہ پر دیے جانے والے اس متعہ کو "متعة الطلاق" کہا جاتا ہے۔

قرآن مجید میں جس عورت کا مہر مقرر نہ کیا گیا ہو اور اسے دخول سے پہلے طلاق دے دی جائے تو اس کے متعہ کا ذکر ان الفاظ سے کیا ہے:

﴿لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِن طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعاً بِالْمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى الْمُحْسِنِينَ﴾ (البقرة: ۲۳۶) (تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم اپنی ان بیویوں کو طلاق دو جن سے تم نے نہ تعلقات قائم کیے ہیں، نہ ان کا مہر مقرر کیا ہے، انہیں کچھ دے دلا دو، خوش حال اپنی گنجائش کے مطابق اور تنگ دست اپنی گنجائش کے مطابق دستور کے مطابق تحفہ ہو جو احسان کرنے والوں پر لازم ہے۔)

اور تمام مطلقات کو متعہ دینے کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہے:

﴿وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ حَقّاً عَلَى الْمُتَّقِينَ﴾ (البقرة: ۲۴۱) (اور اپنی مطلقہ عورتوں کو دستور کے مطابق کچھ دے دلا کر رخصت کرو، یہ اہل تقویٰ پر لازم ہے۔)

خلوتِ صحیحہ کا مطلب:

اوپر کئی جگہ خلوت صحیحہ کا ذکر آیا۔ خلوتِ صحیحہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ زوجین کے درمیان جماع سے کسی طرح کی رکاوٹ کے بغیر تنہائی پائی جائے یعنی نہ تو عورت کی شرم گاہ میں کوئی ایسا مرض ہو جس کے سبب جماع نہ ہوسکتا ہو، یہ حسی مانع کہلاتا ہے۔ نہ تو حیض جیسا کوئی شرعی مانع ہو۔ نہ ان کے درمیان کوئی شخص موجود ہو، خواہ وہ سویا ہوا ہی کیوں نہ ہو یا اندھا ہی کیوں نہ ہو۔ البتہ اگر غیر عاقل چھوٹا بچہ موجود ہو تو خلوت صحیحہ مانی جائے گی اور اگر دونوں میں سے کسی کو ایسی بیماری لاحق ہو جس کے سبب جماع ممکن نہ ہو تب بھی خلوت صحیحہ نہیں مانی جائے گی۔

خلاصہ یہ کہ ان رکاوٹوں میں سے کوئی رکاوٹ اور مانع موجود نہ ہو تو خلوتِ صحیحہ ہوگی جو کہ جماع کے قائم مقام مانی جائے گی اور رکاوٹ موجود ہو تو خلوتِ فاسدہ ہوگی اور اس کو جماع کے حکم میں نہیں مانا جائے گا۔　　(ہندیہ: ۱/۳۰۴)

مہر مؤجل اور مہر معجل:

مہر معجّل نقد مہر کو کہتے ہیں اور مہر مؤجل اس کو کہتے ہیں جس کو ادھار رکھا جائے، خواہ اس کے لیے کوئی خاص تاریخ مقرر کی جائے یا صرف ادھار رکھا جائے، کوئی تاریخ مقرر نہ کی جائے۔ دونوں طرح مہر مقرر کرنا صحیح ہے لیکن بہتر یہ ہے کہ مہر کو نقد ادا کر دیا جائے۔

(ہندیہ: ۱/۳۱۸)

اس لیے کہ معجم طبرانی (۲۳/۲۴، رقم ۶۰) میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے مہر کی ادائیگی کے بعد ان کی رخصتی کرائی۔ اسی طرح جب آنحضرت ﷺ نے حضرت علیؓ کی شادی حضرت فاطمہؓ سے کرائی تو ان کو حکم دیا کہ کچھ دیے بغیر اپنی اہلیہ کے پاس نہ جانا۔　　(مجمع الزوائد: ۴/۵۲۰، رقم: ۷۴۹۸)

جب مہر کی ادائیگی سے پہلے بیوی مرجائے

اگر بیوی کا انتقال ہو جائے اور شوہر نے ابھی تک مہر ادا نہ کیا ہو تو مہر معاف نہیں ہوگا۔ اب شوہر پر لازم ہے کہ مہر کی رقم بیوی کے ورثاء کو دے۔ ان ورثاء میں خود چونکہ شوہر بھی شامل ہے لہٰذا اپنے حصہ کا وہ خود حق دار ہوگا یعنی اگر مرنے والی بیوی کی خود اس سے یا کسی اور شوہر سے کوئی اولاد موجود نہیں ہے تو آدھے کا حق دار شوہر ہوگا اور آدھا مہر مرنے والے کے دوسرے ورثاء مثلاً: ماں باپ بھائی بہن بھتیجے وغیرہ پر شرعی اصولوں کے مطابق تقسیم کر دیا جائے گا اور اگر مرنے والی کی اولاد موجود ہو تو چوتھائی مہر کا حق دار شوہر ہوگا اور باقی اولاد اور دوسرے ورثاء کو ملے گا؛ ﴿وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِن لَّمْ يَكُن لَّهُنَّ وَلَدٌ فَإِن كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ﴾ (النساء: ۱۲) (اور جو کچھ تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اگر ان کے اولاد نہ ہو تو تمہارا آدھا ہے اور اگر ان کے اولاد ہو تو وہ جو بھی چھوڑ جائیں اس کا چوتھائی تمہارا ہے)

مہر معاف کرانا:

لوگوں میں رواج ہے کہ اپنی یا بیوی کی موت کے وقت مہر معاف کراتے ہیں۔ ظاہر ہے اس طرح کے حالات میں بیوی کے پاس معاف کرنے کے علاوہ کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا۔ اکثر وہ دل سے معاف بھی نہیں کرتی لہٰذا یہ معافی معتبر نہیں ہے۔ اس معافی کے باوجود مہر معاف نہیں ہوگا۔ (البحر الرائق: ۳/۱۵۱)

مشرکین کے مطالبات اور قرآنی اعلان

عبدالسبحان ناخدا ندوی

أَعُوذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيمِ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ

﴿وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ﴾(یونس:۲۰)

(اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ آخران پرانکے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں اترتی، آپ کہیے غیب تو بس اللہ کے ہاتھ میں ہے بس انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں۔)

وَيَقُولُونَ لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ؛ یہ کہنے والے مشرکین تھے جو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ ہم تو بس معجزہ کے انتظار میں ہیں جیسے ہی ہم اپنا فرمائشی کوئی معجزہ دیکھیں گے بس سیدھے اسلام قبول کرلیں گے۔ یہ ایمان نہ لانے کے لیے محض ایک بہانہ تھا ورنہ ان کا حال یہ تھا کہ فرمائشی معجزات دیکھنے پر ہی قطعاً ایمان نہ لاتے۔ ان کے لیے سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم تھا۔ بار باران سے کہا گیا کہ اگر تمہارے اندر صلاحیت ہے تو اس جیسی کوئی سورت لے آؤ، اس کے لیے دنیا بھر کے انس وجن سے مدد لو لیکن اس کے جواب میں ان کے نزدیک سوائے خاموشی کے کچھ نہ تھا اور معجزات کے تعلق سے وہ بہانے بنا سکتے تھے اور انہوں نے بہانے بنائے بھی لیکن عربی زبان تو ان کی اپنی مادری زبان تھی، ان کو اس کا دعویٰ تھا کہ وہ اس زبان کے معیار کمال تک پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ عربوں کے نزدیک نسب کے طعنے کے بعد سب سے بڑا طعنہ یہ تھا کہ وہ عربی نہیں جانتا، اس کے باوجود قرآن کریم کے چیلنج پر چیلنج کے جواب میں پورے عرب کی خاموشی اس کی دلیل تھی کہ وہ ہار مان چکے ہیں اور اس کلام کے کلام اللہ ہونے کی سب سے بڑی نشانی ان کے پاس آچکی تھی۔ اس کے بعد مزید نشانیوں کا مطالبہ کرنا اپنی خفت کو مٹانے کی ایک کوشش کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

مشرکین کی ایک تعداد ظاہر پرست اور مادہ پرست تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہمیشہ دیکھی بھالی چیزوں پر یقین کرتے تھے، اس لیے ان لوگوں کا ہمیشہ یہ مطالبہ رہا کہ جب تک ہم کوئی فرمائشی نشانی مکمل ہوتی نہ دیکھیں گے اس وقت تک ایمان لانے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

"فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ" ان سے گویا یہ کہا جارہا ہے کہ کمال انسانی یہ ہے کہ دیکھی جانے والی چیزوں سے اَن دیکھی چیزوں تک پہنچا جائے، جسے انسان نے دیکھ لیا اسے جان کر اس نے کون سا کمال کیا؟ یہ سطح تو انتہائی کم عقل بلکہ بے عقل جانور بھی کسی نہ کسی درجہ میں رکھتے ہیں۔

فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ؛ کہہ کر یہ بیان کرنا بھی مقصود ہے کہ اصل نظام غیب سے چل رہا ہے۔ ظاہری نظام تو غیبی نظام تک پہنچنے اور اس پر یقین کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ جو لوگ ظاہری نظام کو اصل قرار دے کر غیبی نظام کو سرے سے تسلیم نہیں کرتے یا غیبی نظام کو اتفاقات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ قرآن کا ایسے لوگوں کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ وہ اللہ کے نظام کو سمجھنے یا سمجھانے میں ''مکر'' سے کام لیتے ہیں اور بات کو اس طرح قبول نہیں کرتے جس طرح وہ حقیقت میں ہے۔ ان کے مقابلہ میں جو لوگ غیبی نظام کو اصل اور بنیاد قرار دیتے ہیں اور ظاہری نظام کو غیبی نظام پر یقین کا ذریعہ سمجھتے ہیں اور اس کا یقین رکھتے ہیں کہ جو کچھ ظاہر ہے وہی سب کچھ نہیں بلکہ سب کچھ کہیں اور ہے جہاں کے فیصلے اس ظاہری نظام پر اثر انداز ہوتے ہیں، اصل طاقت کا سرچشمہ کوئی اور ہے۔ قرآن حکیم ایسے لوگوں کو نشانیوں میں غور وفکر کرنے والا قرار دے کر ان کی حوصلہ افزائی کرتا ہے، ان کو ''اُولوالالباب'' یعنی حقیقی عقل مند قرار دیتا ہے، ان کے بارے میں یہ امید ظاہر کرتا ہے کہ ایسے لوگ صحیح فکر سے کام لیں گے تو صحیح نتیجہ تک ضرور پہنچ جائیں گے۔ اس مبارک سورت کا ایک موضوع مظہر اور حقیقت کے درمیان فرق کو واضح کرنا بھی ہے، اس لیے جابجا ''ظاہر'' اور ''غیب'' پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مشرکین مکہ گرچہ حقیقت کو مانتے تھے اور اس کا اعتقاد رکھتے کہ تمام کاموں کی تدبیر کرنے والا اللہ رب العزت ہے لیکن اس کے باوجود مظاہر میں ایسے الجھ گئے تھے کہ ظاہر پرست ہو کر رہ گئے تھے، اس لیے آپ ﷺ کی سچائی کو اندر ہی اندر جاننے کے باوجود ماننے کے لیے تیار نہیں تھے

اور نشانیوں کا مسلسل مطالبہ کیے جا رہے تھے۔

ہر انسان فطری طور پر یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ جو کچھ وہ دیکھتا ہے اس کے علاوہ بہت کچھ ہے، جو وہ دیکھتا نہیں اور جس کے بارے میں اسے معلوم نہیں لیکن اس کا وجود ضرور ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جو شخص کھلم کھلا چیلنج بھرے انداز میں اللہ کا نام لے کر بعض غیبی چیزوں کا دعویٰ کرے، جب کہ حالات اس دعویٰ کے مطابق بالکل سازگار نہ ہوں بلکہ مکمل اس کے دعویٰ کے مخالف جا رہے ہوں پھر بھی اس کے دعویٰ کے مطابق وہ چیز حرف بحرف پوری ہو جائے تو عقل یہ کہتی ہے کہ اسے نہ صرف یہ کہ سچا سمجھا جائے بلکہ وہ اپنے تعلق سے اللہ کے حوالہ سے جو دعویٰ کرتا ہے اسے بھی تسلیم کیا جائے۔

مکی دور میں جب مسلمانوں کے لیے اپنا وجود بچانا انتہائی مشکل نظر آ رہا تھا تو قرآن کریم نے بار بار یہ دعویٰ کیا اور بہت اصرار سے کیا کہ اہل مکہ شکست کھائیں گے، پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے، خود مکہ ہی میں یعنی اپنی ہی زمین پر ایک شکست خوردہ قوم بنیں گے، محمد ﷺ غالب آئیں گے، اللہ کا نور پورا ہو کر رہے گا، محمد ﷺ جس دین کی دعوت دے رہے ہیں وہ غالب آ کر رہے گا، کفر و شرک آہستہ آہستہ اس سرزمین سے سمٹتا چلا جائے گا، محمد بھی دیکھیں گے اور مشرکین بھی دیکھیں گے کہ کون فتنہ میں پڑتا ہے؟ تم بھی انتظار کرو اور میں بھی انتظار کرتا ہوں، دیکھیں کس کا انتظار نتیجہ خیز رہتا ہے اور کس کا انتظار اس کے منہ پر مارا جاتا ہے؟ تم اپنے تمام شرکاء کو بلاؤ اور میرے خلاف جو سازش کرنا چاہو کرو مجھے مہلت ہی نہ دو، دیکھیں تم کیا کر سکتے ہو؟ یہ تمام قرآن کریم کے دعوے تھے اور کھل کر کیے گئے تھے۔ مشرکین کے لیے بہت ہی آسان تھا کہ آنحضرت ﷺ کا خاتمہ کرتے اور اپنی جیت کا جشن مناتے، اس لیے کہ تمام وسائل ان کے پاس تھے لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تمام دعوے حرف بحرف پورے ہوئے اور ان میں سے کوئی ایک دعویٰ بھی جو اپنے اندر ہر طرح کا چیلنج رکھتا تھا جزوی طور پر پورا ہونے سے رہ نہیں گیا۔ قرآن کریم کی آیات کی روشنی میں دیکھا جائے تو "لَوْلَا أُنزِلَ عَلَيْهِ آيَةٌ مِّن رَّبِّهِ" کہہ کر مشرکین نے جب نشانی کا مطالبہ کیا تو "فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ" کہہ کر ان کو واقعی نشانی دی گئی اور یہ کہا گیا کہ جتنے دعوے ہم نے کیے ہیں وہ سب غیب ہیں لیکن وہ پورے ہو کر رہیں گے۔ تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کروں گا۔ وہ عملاً پورے ہوئے لہٰذا نشانی تو پوری ہو گئی، اس کے بعد مشرکین کو اپنے وعدے کے لحاظ سے ایمان لانا چاہیے تھا لیکن وہ نہیں لائے۔ اس سے ایک اور نشانی بھی پوری ہوئی وہ یہ کہ اللہ نے ان کے بارے میں یہ فرمایا تھا کہ یہ لوگ نشانیاں دیکھ لیں تب بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ انہوں نے قرآن کریم کے دعووں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھا اور خود قرآن کی پیشین گوئی کے مطابق ایمان سے محروم رہے۔ ہاں! ان کی نسل جو مکی دور میں پیدا ہی نہیں ہوئی تھی یا بلوغ کی عمر تک نہیں پہنچی تھی وہ ایمان لائی۔

إِنَّمَا الْغَيْبُ لِلَّهِ؛ کہہ کر یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ انسان اللہ پر اعتماد رکھے، ظاہری اسباب میں اس قدر الجھ کر نہ رہ جائے کہ ہر چیز کو ظاہری اسباب کے لحاظ سے ناپنے لگ جائے۔ بسا اوقات ظاہری اسباب بڑے مایوس کن ہوتے ہیں اور انسان اگر اس کی بنیاد پر اپنے کاموں کو دیکھے تو سوائے مایوسی کے اس کے ہاتھ کچھ نہ لگے۔ اس لیے جو لوگ اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے کام کرتے ہیں ان کے لیے ہدایت ہے کہ وہ غیب پر بھروسہ رکھیں، ظاہری حالات دیکھ کر وہ تدبیر ضرور کریں لیکن نتائج کو ظاہری حالات پر منحصر نہ سمجھیں۔ پردۂ غیب سے کیا کچھ ظہور میں آنے والا ہے کون جانتا ہے؟ یہ مبارک ٹکڑا ہر داعی دین کے سامنے امید کے دیے روشن کرتا ہے تاکہ کام کرنے والے کبھی حالات سے مایوس ہو کر ہرگز اپنا کام نہ چھوڑیں۔

فَانتَظِرُوا إِنِّي مَعَكُم مِّنَ الْمُنتَظِرِينَ؛ یہ ٹکڑا اس کی بشارت دیتا ہے کہ حالات چاہے جس قدر سخت ہوں، نتیجہ اکثر اہل حق کے حق میں ظاہر ہوتا ہے۔ دونوں کے انتظار میں فرق ہے، اہل باطل کا انتظار یہ ہے کہ اہل حق فنا ہو جائیں اور حق کا نشان مٹ جائے۔ اہل حق کا انتظار یہ ہے کہ اللہ کی زمین سے ہر طرح کے فساد کا خاتمہ ہو جائے۔ حکم اس کا ہے اہل حق اہل باطل کا چیلنج قبول کر لیں اور صبر واستقامت کا نمونہ بن کر دکھائیں اور یہ ثابت کریں کہ ان کی دعوت ان کے اخلاق، ان کے اصول اور ان کے کردار کا دنیا کے پاس کوئی جواب نہیں۔

صحابہ کرامؓ کی محبت

مولانا سید محمود حسن حسنی ندویؒ

محبت بڑی اہم اور نازک چیز ہے۔ یہ انسان کو عروج پر پہنچاتی ہے اور اس کے ذریعہ سے آدمی اللہ سے بڑا قریب ہوجاتا ہے لیکن بعض اوقات یہی محبت آدمی کو بہت گرادیتی ہے اور گراتی ہی چلی جاتی ہے۔ اگر محبت اللہ کے لیے ہے تو اس کے بڑے بڑے غیر معمولی اثرات ونتائج ظاہر ہوتے ہیں اور اگر غیر اللہ کی محبت مع اللہ ہے تو وہ مہلک بن جاتی ہے اور تباہ کن ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جس میں دنیا کی قومیں تباہ ہوئی ہیں اور دنیا کے اندر بے شمار مذاہب کے وجود کا بھی یہی سبب ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے دین بگڑے ہیں اور ان میں تحریف ہوئی ہے، کیونکہ شیطان محبت کے راستہ سے آدمی کو مارتا اور تباہ کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب وہ آدمی کو نمازوں کے ذریعہ تباہ نہیں کر پاتا، یا قرآن پاک کی تلاوت میں خلل نہیں ڈال پاتا تو پھر وہ محبت کے راستہ سے آکر آدمی کو برباد کرتا ہے۔ اسی لیے مشائخ کے یہاں محبت پر ہمیشہ خاص نگاہ رکھی جاتی ہے تاکہ محبت کی سوئی صحیح رہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ نے بڑی بلیغ واہم بات لکھی ہے کہ یہود ونصاریٰ کی گمراہی کا سبب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اپنے نبیوں سے محبت اللہ کے ساتھ کی یعنی عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے محبت میں غلو کیا اور اللہ کی محبت کے ساتھ حضرت عیسیٰ سے محبت کی لیکن مسلمانوں کا یہ امتیاز رہا ہے کہ انہوں نے اللہ کی محبت کے ساتھ اپنے نبی سے محبت نہیں کی بلکہ اپنے نبی سے محبت اللہ کے لیے کی کیونکہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو اپنی مخلوق میں سب سے زیادہ محبت رسول اللہ ﷺ سے ہے۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کو بھی اس سے محبت تھی جس سے اللہ کو محبت ہو اور یہ بات آپ ﷺ کو وحی کے ذریعہ معلوم ہوجاتی تھی کہ اللہ کو کس سے محبت ہے؟ اسی سے آپ ﷺ محبت کرتے تھے۔

ہمارے لیے یہ ایک بہترین معیار ہے کہ ہم دیکھیں کہ رسول ﷺ نے کس سے کتنی محبت فرمائی ہے؟ رسول ﷺ نے صحابہؓ سے محبت کی ہے اور اسی نسبت سے تمام مسلمانوں کو بھی ان سے محبت ہے۔ اس لیے کہ انہوں نے مختلف مواقع پر نبی ﷺ کا غیر معمولی ساتھ دیا اور اپنی خواہشات کو آخری درجہ میں قربان کیا اور اپنے جذبات کی انہوں نے انتہائی درجہ قربانیاں دیں۔ ان میں بعض وہ بھی ہیں جو اسلام سے قبل مخالف لشکروں میں رہے ہیں اور ان کے جذبات بالکل معاندانہ ومخالفانہ رہے ہیں لیکن پھر انہوں نے خود کو رسول ﷺ کے سامنے پیش کردیا اور آپ ﷺ کے جھنڈے تلے آگئے۔

حضرت حبشیؓ جن کے وار سے سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ شہید ہوئے اور حضرت ہندؓ جنہوں نے عم نامدار رسول ﷺ کا کلیجہ چبایا، یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا لیکن یہ سب لوگ جب حضور ﷺ کے جھنڈے کے نیچے آگئے تو ان کا حال یہ ہوگیا کہ خود حضرت ہندؓ نے ایک موقع پر یہ بات کہہ دی کہ

''ایمان لانے سے پہلے مجھے حضور ﷺ اور آپ کا جتھہ سب سے زیادہ مبغوض تھا لیکن اب آپ سے بڑھ کر کوئی محبوب نہ رہا۔''

اسی سے ملتی جلتی بات حضرت عمرو بن العاصؓ نے بھی کہی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ خصوصیت تھی کہ آپ ﷺ کے ہاتھ پر ہاتھ دیتے ہی آدمی کا تزکیہ ہوجاتا تھا اور محبت وعظمت کی ایک نظر آدمی کو بالکل پاک صاف کردیتی تھی۔ اسی کا اثر تھا کہ حضرت وحشیؓ نے پھر اپنے ماقبل اسلام کے واقعہ کی تلافی اس طرح کی کہ مدعی نبوت مسیلمہ کذاب کا سرتن سے جدا کردیا اور وہ انہی کے وار سے ہلاک ہوا۔

حضرت ابوسفیانؓ نے بھی اپنی غلطیوں کی ایسی تلافی کی کہ اپنے بیٹے حضرت معاویہ کو حضور ﷺ کے سپرد کردیا اور درخواست کی کہ

''اس کو کاتب بنالیجیے، یہ آپ کی خدمت کریں گے۔''

صحابہ کرامؓ میں سے یہ ایک دو نظیر نہیں ہے بلکہ ایسی بے شمار نظیریں موجود ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حضور ﷺ کی جماعت کی تربیت صحیح نہیں ہوپائی اور وہ لوگ آپ ﷺ کے بعد راہِ راست

سے ہٹ گئے تو حقیقت میں یہ ایک بہت بڑا الزام ہے۔

''منہاج السنہ'' میں امام شافعیؒ کے حوالہ سے امام ابن تیمیہؒ نے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ ''یہودیوں سے پوچھا گیا کہ سب سے اچھے لوگ کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ حضرت موسیٰ کے لوگ ہیں۔ عیسائیوں سے پوچھا گیا کہ ان کے لوگوں میں سب سے اچھے کون ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ جو حضرت عیسیٰ کے حواری ہیں لیکن اہل تشیع کی عجیب ہی منطق ہے، جب ان سے پوچھا گیا کہ سب سے برے لوگ کون ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں۔''

یہی بات نواب محسن الملکؒ نے لکھی ہے جو پہلے شیعہ تھے لیکن بڑے عالی دماغ اور بالغ نظر تھے، انہوں نے حقائق پر غور کیا پھر انہوں نے شیعیت سے سچی توبہ کی۔ نواب محسن الملک کی عبارت ملاحظہ ہو:

''حقیقت یہ ہے کہ جو اعتقاد شیعوں کا بہ نسبت صحابہ کرامؓ کے ہے، اس سے الزام آپ ﷺ کی نبوت پر آتا ہے اور سننے والے کو مذہبِ اسلام پر شبہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی اس امر پر یقین کرلے کہ جو لوگ آنحضرت ﷺ پر ایمان لائے، ان کے دلوں پر کچھ اثر ایمان و اسلام کا نہ تھا اور وہ صرف ظاہر میں مسلمان اور عیاذاً باللہ! باطن میں کافر تھے اور یہ حضرت ﷺ کے انتقال کرتے ہی اس سے پھر گئے۔ وہ حضرت ﷺ کی نبوت کی تصدیق کر نہیں سکتا اور کہہ سکتا ہے کہ حضرت ﷺ اگر سچے نبی ہوتے تو کچھ نہ کچھ ان کی ہدایت میں تاثیر ہوتی اور کوئی نہ کوئی دل سے ان پر ایمان لایا ہوتا اور من جملہ ہزاروں لاکھوں آدمیوں کے جوان پر ایمان لائے، سو دو سو آدمی تو ایمان پر ثابت قدم رہتے۔ اگر صحابہ کرام تمہارے عقائد باطلہ کے موافق اسلام و ایمان میں کامل نہ تھے تو وہ لوگ کون سے ہیں جن پر حضرت ﷺ کی ہدایت کا اثر ہوا اور ویسے لوگ کتنے ہیں جن کو حضرت ﷺ سے فائدہ ہوا؟ اگر اصحابِ نبی سوائے معدودے چند کے بقول تمہارے ''سب۔ عیاذاً باللہ! ۔ مرتد و منافق تھے'' تو دین اسلام کو کس نے قبول کیا؟ اور پیغمبر ﷺ کی تعلیم و تلقین سے کس کو فائدہ پہنچا؟''

(آیاتِ بینات: ۱/۶-۷)

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص غور و فکر سے کام لے اور اپنی فکر کا جائزہ لیتا رہے کہ وہ کہاں جا رہا ہے؟ اس لیے کہ اگر ہم سلف کے طریقہ پر نہیں رہیں گے اور سلف سے بدگمان ہو جائیں گے اور جمہور کے راستہ سے ہٹیں گے تو یقیناً ہم گمراہ ہوں گے۔ اس لیے کہ پھر شیطان ایسے جکڑ لیتا ہے جیسے بھیڑیا اپنی گرفت میں اس بکری کو لے لیتا ہے جو ریوڑ سے ہٹتی ہے۔

جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹئے گا

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ

''میں ایک گُر کی بات بتاتا ہوں کہ جمہور اہل سنت کے مسلک سے کبھی نہ ہٹئے گا۔ اس کو لکھ لیجیے، چاہے آپ کا دماغ کچھ بھی بتائے، آپ کی ذہنیت آپ کو کہیں بھی لے جائے، کیسی ہی قوی دلیل پائیں، جمہور کے مسلک سے نہ ہٹئے گا۔ اللہ تعالیٰ کی جو تائید اس کے ساتھ رہی ہے جس کے شواہد و قرائن ساری تاریخ میں موجود ہیں، چونکہ اللہ تعالیٰ کو اس دین کو باقی رکھنا تھا اور باقی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی اصلی حالت پر قائم رہے، ورنہ بدھ مذہب کیا باقی ہے؟ عیسائیت کیا باقی ہے؟... اللہ تعالیٰ کی اس دین کے ساتھ جو تائید ہے، جو قوی دلائل ہیں، جو سلامتِ فکر اور سلامتِ قلب ہے، اس کے ساتھ جو ذہین ترین انسانوں کی محنتیں اور غور و خوض کے نتائج ہیں اور ان کا جو اخلاص ہے اور ذہن سوزی ہے، وہ کسی مذہب کو حاصل نہیں ہے... لہٰذا مسلکِ جمہور سے اپنے کو وابستہ رکھیے۔ اس کا بڑا فائدہ ہوگا، اللہ کی خاص عنایت ہوگی، اس کی نصرت و برکت ہوگی اور حسن خاتمہ بھی ہوگا۔''

(طالبانِ علوم نبوت کا مقام اور ان کی ذمہ داریاں: ۱/ ۲۱۸-۲۱۹)

چند لمحے سلف صالحین کی صحبت میں

محمد امین حسنی ندوی

سلفِ صالحین کی جماعت ایسی جماعت ہے جس کے متعلق زبان نبوت نے گواہی دی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی حفاظت وصیانت کے لیے قبول فرمایا اور امت کے لیے ان کو مقتدا اور پیشوا بنایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی ان کو قبولیت کا مژدہ سنا دیا گیا:

"خير أمتي قرني ثم الذين يلونهم ثم الذين يلونهم."

اور یہ گواہی اسی لیے دی گئی ہے کہ ان کی زندگی سے اور ان کی صحبت سے کچھ سیکھا جائے۔ ان کی خشیت، ان کے دل کی صفائی، جذبات واحساسات کی پاکیزگی، اخلاص وللّٰہیت، جذبات کی نرمی، ایمان کی پختگی، اعمال صالحہ میں مداومت کی کچھ کرنیں ان سے حاصل کی جائیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو آخرت کا اتنا خوف تھا کہ فرماتے: "کاش! میں حساب وکتاب سے بچ پاتا۔ کاش! میں کوئی درخت ہوتا جسے کاٹ دیا جاتا۔"

حضرت عمر بن خطابؓ ایک مرتبہ سورۃ الطّور کی تلاوت کر رہے تھے، جب اس آیت پر پہنچے ﴿إِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ﴾ (بے شک تیرے رب کا عذاب واقع ہو کر رہے گا) تو اتنا روئے کہ شدت گریہ سے بیمار ہو گئے۔ لوگ عیادت کے لیے آئے تو فرمایا کہ "میں اس بات کو پسند کرتا ہوں کہ معاملہ برابر سرابر ہو نہ اجر ملے نہ سزا۔"

حضرت عثمان غنیؓ جب کسی قبر کے پاس ہوتے تو اتنا روتے کہ داڑھی تر ہو جاتی اور فرماتے کہ میں جنت اور جہنم کے درمیان اس حال میں کھڑا ہوں کہ مجھے کچھ علم نہیں کہ کس طرف جانے کا حکم ملے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے: "زیادہ امیدیں نہ لگاؤ، زیادہ امیدیں اخرت کو بھلا دیتی ہیں۔ جان لو کہ یہ دنیا منھ موڑ کر جا رہی ہے اور آخرت آن پڑی ہے، دنیا کے پیچھے مت پڑو، آخرت والے بنو، آج عمل کا وقت ہے کوئی حساب نہیں، کل حساب ہوگا عمل نہیں۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے پاس کہتے تھے کہ میری خواہش یہ ہے کہ میرا معاملہ اصحاب الیمین کے بجائے اصحاب المقربین کے ساتھ کیا جائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے فرمایا: "میں تو چاہتا ہوں کہ موت کے بعد دوبارہ نہ اٹھایا جائے یعنی میرا حساب وکتاب نہ کیا جائے۔ مجھے اس سے بھی خوف ہے کہ مجھے دوبارہ اٹھنا ہوگا اور میرے ساتھ کیا معاملہ ہوگا؟"

ایک سائل حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے پاس آیا اور کچھ ان سے مانگا، حضرت ابن عمرؓ نے اپنے صاحبزادہ سے کہا: اسے کچھ دے دو۔ جب وہ چلا گیا تو ان کے صاحبزادہ نے کہا: "اللہ تعالیٰ آپ کے دینے کو قبول فرمائے۔" انہوں نے کہا: اگر مجھے یہ معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ نے میرے ایک سجدہ کو یا میرے صدقہ کو قبول فرما لیا تو مجھے موت سے زیادہ پسندیدہ چیز کوئی نہ لگے، کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿إِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ (المائدة: ۲۷)

حضرت عبدالرحمان بن حارثؒ فرماتے ہیں کہ ایک موقع پر میں حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ کے پاس ان کی عیادت کے لیے گیا، کسی نے ان کے سامنے یہ آیت پڑھی: ﴿لَهُم مِّن جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ﴾ (الأعراف ٤١) وہ اس قدر روئے کہ ہم کو لگا کہ ان کی روح پرواز کر گئی۔

حضرت ادریس بن حوشبؒ فرماتے ہیں کہ "میں نے حضرت حسن بصریؒ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے زیادہ ڈرنے والا نہیں دیکھا، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جہنم صرف انہی کے لیے بنائی گئی ہے۔"

حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے وقت جب آپ کے صاحبزادہ نے طبیعت کے بارے میں پوچھا تو فرمایا کہ "ابھی جواب کا وقت نہیں بس دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ میرا خاتمہ ایمان پر کر دے کیوں کہ ابلیس اپنے سر پر خاک ڈالتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ تیرا ایمان کی سلامتی کے ساتھ دنیا سے جانا میرے لیے بربادی ہے اور میں اس سے کہہ رہا ہوں کہ ابھی نہیں، جب تک ایک بھی سانس باقی ہے میں خطرے میں ہوں، مجھے اطمینان نہیں ہو سکتا۔"

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ

بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

محمد ارمغان بدایونی ندوی

آزادیِ ہند کے بعد جب ملک میں یونیفارم سول کوڈ کا خطرہ اندیشوں سے بڑھ کر واقعات کی شکل میں سامنے آنے لگا، نیز حکومتی رجحانات کے ساتھ تجدد پسند مسلمانوں کی جانب سے بھی یہ مطالبات ہونے لگے کہ ہندوستان میں تمام فرقوں کا ایک مشترک عائلی قانون ناگزیر ہے ورنہ ملک میں قومی وحدت اور یک رنگی پیدا نہیں ہو سکتی، تو ہندوستان کے روشن ضمیر علمائے دین نے بروقت اس فتنہ کا تعاقب کیا اور تمام مکاتبِ فکر پہلی بار ۱۹۷۲ء کو ممبئی میں جمع ہوئے، جہاں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کے نام سے ایک ایسا پلیٹ فارم بنایا گیا جو مسلمانوں کے لیے شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے اور شرعی نقطہ نگاہ سے ان کی موت وحیات کا مسئلہ ہے۔ اس بورڈ کے متفقہ طور پر پہلے صدر حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ منتخب ہوئے۔

حضرت قاری صاحبؒ کی وفات کے بعد ۱۹۸۳ء میں متفقہ طور پر مسلمانوں کی اجتماعیت کے سب سے بڑے پلیٹ فارم کے صدر مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ منتخب ہوئے اور یہ عجیب اتفاق تھا کہ اس موقع پر حضرت مولانا اپنی نقرس (Gout) کی تکلیف کے سبب اس اجلاس میں موجود بھی نہ تھے۔

بورڈ کی صدارت کا فیصلہ حضرت مولاناؒ کے لیے ان کی افتادِ طبع، صحتِ جسمانی، عمر اور دوسری ذمہ داریوں ومشاغل کے لحاظ سے گرچہ میل نہ کھاتا تھا، مگر ملک کے سیاسی حالات کی نزاکت اور خود بورڈ کو اختلاف وانتشار سے بچانے کے لیے اس ذمہ داری کو قبول کرنا حضرت مولاناؒ کے لیے ایک ناگزیر امر تھا، ورنہ بقول مفکر اسلامؒ:

''اگر یہ کسی بھی سیاسی، ملی تنظیم اور باعثِ افتخار واعزاز منصب کے قبول کرنے کا معاملہ ہوتا تو میں بغیر کسی ادنیٰ تردد کے انکار کر دیتا۔'' (کاروان زندگی: ۱۱۲/۳)

حضرت مولاناؒ کے عہد صدارت میں بورڈ اور ملت اسلامیہ ہندیہ کو بڑے سنگین مراحل سے گذرنا پڑا، مگر یہ خوش قسمتی کی بات تھی کہ اس وقت ملت اسلامیہ ہندیہ کے سر پر حضرت مولاناؒ کی شکل میں ایک صاحب ضمیر، بے باک و بے لوث قائد کا سایہ تھا۔

حضرت مولاناؒ کے عہد صدارت میں جو حالات پیش آئے ان کی سنگینی کا اندازہ ان کے ان الفاظ سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ میرے صدارت قبول کرنے کے کچھ عرصہ بعد ہی نہ صرف بورڈ کی تاریخ میں بلکہ ملت اسلامیہ ہندیہ کی تاریخ میں ایسے سنگین مرحلے پیش آئیں گے جو شاید اس سے پہلے عرصہ سے پیش نہیں آئے اور جن میں قیادت کے غیر معمولی حزم وعزم، ملت کے نظم وضبط، علمائے دین وماہرین قانون کے علم ومطالعہ، ذہانت وتدبر اور عوام کے انقیاد واطاعت، صبر وتحمل، قائدین پر اعتماد اور تفویض وتسلیم کی غیر معمولی صلاحیت کے ثبوت دینے اور ملی شعور کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت پیش آئے گی۔'' (أیضاً: ۱۱۳/۲)

حضرت مولاناؒ کے عہد صدارت میں بورڈ کا پہلا عظیم الشان اجلاس عام ۱۹۸۵ء کو کلکتہ میں منعقد ہوا جس میں مسلمانانِ ہند کی تمام دینی وسیاسی جماعتیں، مسلم تنظیمیں، مختلف مکاتبِ خیال کے ذمہ دار مسلم دانشور، سربرآوردہ علماء اور قانون دانوں کی ایک بڑی تعداد شریک ہوئی۔ اس اجلاس میں حضرت مولانا کا صدارتی خطاب ہوا، جس میں آپ نے بطور خاص بے باک اور بے لاگ طریقہ پر مسلمانوں کا احتساب کیا، جس کا الحمد للہ مجمع پر بہت اچھا اثر پڑا۔

یہ اجلاس عام ۸/اپریل ۱۹۸۵ء کی شام کو ختم ہوا تھا اور اسی ماہ کی ۲۳/تاریخ کو ہندوستانی مسلمانوں اور بالخصوص بورڈ کی تاریخ میں ایک فیصلہ کن مرحلہ پیش آ گیا، بقول حضرت مولانا کہ

''سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔''

دراصل ۲۳/اپریل کو سپریم کورٹ نے نفقہ مطلقہ کے مسئلہ میں وہ فیصلہ کیا تھا جس کی سنگینی کے متعلق حضرت مولاناؒ رقم طراز ہیں:

''اس میں دین کی کھلی مداخلت، قرآن مجید کے الفاظ کی من

مانی تشریح وتفسیر، شریعتِ اسلامی کی توہین اور اس پر کھلا حملہ تھا۔ اس نے ملت کو جھنجوڑ کر رکھ دیا اور اس کو اپنے دین وشریعت سے وابستگی، اسلام سے وفاداری اور غیرت وخودداری کے ایک فیصلہ کن مرحلہ پر لاکر کھڑا کر دیا۔'' (أیضاً:۳/۱۱۶)

بلاشبہ حضرت مولاناؒ کے لیے یہ وہ پہلا موقع تھا جب انہیں وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل کا عملی ثبوت پیش کرنا تھا اور جن کے عزم وحزم اور دوراندیشی پر پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کی نگاہیں تھیں۔ اس فیصلہ کن موقع پر حضرت مولاناؒ کی سرپرستی میں ملک گیر سطح پر پُر امن طوفانی احتجاجات ہوئے اور ہر سطح پر عوام وخواص کے ذریعہ ایسی کامیاب کوششیں کی گئیں جن کا حکومت پر اثر پڑے اور وہ پارلیمنٹ میں نیا بل پاس کر کے اس حکم کو منسوخ کرنے پر مجبور ہو۔

ملکی سطح پر ان احتجاجات میں مسلمانوں کے جوش وخروش کا اندازہ حضرت مولاناؒ کے ان الفاظ سے ہوتا ہے:

''مجھے یاد ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام تک ٹرین سے جاتے ہوئے آدھی رات کو اسٹیشن پر مسلمانوں کا مجمع نظر آتا جو اپنے دینی رہنماؤں کی زیارت کرنا چاہتا تھا اور اکثر یہ کہتا کہ شریعت کی حفاظت کے لیے جان ومال حاضر ہے۔'' (أیضاً:۳/۱۲۵)

مسلمانوں کے اس عام رجحان کی شہادت حکومت کے وزیر قانون مسٹر اشوک سین نے بھی حضرت مولاناؒ کے سامنے دی:

''مولانا صاحب! بعض ایسے مسلم ججوں اور ماہرین قانون کے خطوط آئے ہیں جنھوں نے سپریم کورٹ کے فیصلہ کی تائید کی ہے لیکن مسلمانوں کی Majority آپ ہی کے ساتھ ہے۔''

ان احتجاجات کے ساتھ ہی حضرت مولاناؒ کی باریک بیں نگاہ نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ ایک بڑی تعداد میں حکومتِ ہند کو ایسے تار موصول کرائے جائیں جو ایک جمہوری حکومت کو اس مسئلہ پر سنجیدگی سے غور کرنے پر آمادہ کر سکیں۔ اسی لیے آپ نے ملکی سطح پر دستخطی مہم بھی بڑے زوروں پر چلائی جس میں مسلمانوں نے بھرپور حصہ لیا۔

انفرادی طور پر حضرت مولاناؒ نے ایک جرأت مندانہ کوشش یہ بھی کی کہ حکومت کے اعلیٰ ذمہ داروں اور وزیر اعظم سے براہِ راست مل کر مسئلہ کی نزاکت کو سمجھایا اور انہیں یہ باور کرایا کہ مسلمان خواب میں بھی شریعت کے کسی ایک جزء سے دستبردار ہونے کی نہیں سوچ سکتا۔

اس سلسلہ میں ۳؍فروری ۱۹۸۶ء کو حضرت مولاناؒ کی وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے پہلی ملاقات ہوئی، جس میں حضرت مولاناؒ نے باصرار یہ بات کہی کہ اس فیصلہ کو پارلیمنٹ میں بل پیش کر کے کالعدم قرار دیا جائے مگر وزیر اعظم ہند نے معذرت کے انداز میں کہا کہ

''بعض قانونی مجبوریوں کے باعث آرڈیننس نہیں آسکا، اب بل پارلیمنٹ میں آجائے گا۔''

۱۷؍فروری کو اسی مسئلہ کے سبب حضرت مولاناؒ کی وزیر اعظم سے دوسری ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں وزیر اعظم نے اپنے وزیر قانون سے بل کا وہ مسودہ پڑھ کر گوش گذار کرایا جو پارلیمنٹ میں پاس ہونا تھا۔ اس بل کو حضرت مولاناؒ نے حرفاً حرفاً سنا اور جس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی اس میں حذف واضافہ بھی کرایا۔ پھر اگلے دن حضرت مولاناؒ نے اصلاح شدہ بل کا مسودہ دوبارہ دیکھنے کی بات کہی جسے وزیر اعظم ہند نے قبول کیا اور اس طرح اسی مسئلہ کے سبب وزیر اعظم سے بے تکلفانہ یہ تیسری کامیاب ملاقات ثابت ہوئی۔

اسی دوران میں ایک دلچسپ آزمائش سر پر یہ آن پڑی کہ کسی شر پسند نے وزیر اعظم کو اس مسئلہ میں مختلف مسلم ممالک کا طرز عمل معلوم کرنے کا مشورہ دیا کہ ان کے یہاں مسلم پرسنل لا میں ترمیم کی گنجائش ہے کہ نہیں؟ اگر ہے تو پھر ایک جمہوری ملک میں بدرجہ اولیٰ اس کی گنجائش ممکن ہے۔ حضرت مولاناؒ کو جب اس حرکت کا علم ہوا تو بروقت نوٹس لیا اور علی الفور وزیر اعظم سے ملاقات کی اور ان کے سامنے افہام وتفہیم کا ایسا حکیمانہ اسلوب اختیار کیا کہ الحمد للہ ایک بڑا فتنہ اٹھنے سے پہلے ہی دب گیا۔ شاہی دربار میں حضرت مولاناؒ کے وہ تاریخ ساز حکیمانہ الفاظ ملاحظہ ہوں:

''راجیو جی! اگر آپ سے کوئی کہے کہ دوسرے مسلم ممالک بھی تو ہیں وہاں سے معلوم کر لینا چاہیے کہ انہوں نے اپنے عائلی قانون

(Personal Law) میں کوئی ترمیم کی ہے یا نہیں؟ پھر آپ ان کی تقلید کر سکتے ہیں تو آپ کو یہ پوزیشن ہرگز قبول نہیں کرنا چاہیے۔ ہم ایک مرتبہ اگر انکار کریں تو آپ کو چار مرتبہ انکار کرنا چاہیے، اس لیے کہ جہاں تک ہندوستان کی رہنمائی کرنے کا تعلق ہے، آپ کی تیسری پشت ہے۔ ہندوستان علمی و مذہبی حیثیت سے (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) کسی مسلم یا عرب ملک سے کم نہیں ہے، وہ اپنا خود مقام رکھتا ہے۔ مجھے کہنا نہیں چاہیے لیکن کہتا ہوں کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی ماہرین قانون شریعت اسلامی کی مجلس (اکیڈمی) رابطہ عالم اسلامی مکہ معظّمہ کی ”المجمع الفقهي“ ہے جس کا ہندوستان سے میں تنہا ممبر ہوں، بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے ممبران ایک طرف تھے اور میں ایک طرف تھا اور فیصلہ میری رائے پر ہوا۔ یہاں اسی مجلس میں ایسے علماء موجود ہیں کہ اگر ان کا نام جامع ازہر مصر میں لیا جائے تو لوگ احترام سے گردن جھکا لیں۔“

(أیضاً: ۱۳۴/۳)

حضرت مولاناؒ کے براہِ راست ایسے حکیمانہ اسلوب کا وزیر اعظم پر یہ اثر پڑا کہ انہوں نے اس بل کو منظور کرانا اپنی اولین ذمہ داری سمجھا اور اس کے لیے ہر مشکل سے نبرد آزما ہونے کو تیار ہوگئے، اس سلسلہ میں پیش آنے والی تمام قانونی دشواریوں کا انہوں نے جائزہ لیا اور پھر اپنی پارٹی کو ایک وہپ جاری کر کے یہ ہدایت کی کہ ہر فرد کا پارلیمنٹ میں بحث کے دوران حاضر ہونا اور بل کی حمایت میں ووٹ دینا لازمی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انہی کی پارٹی میں اگر کسی کو اس بل سے اعتراض تھا تو وہ بھی ووٹنگ کے دوران اس بل کا حامی نظر آ رہا تھا۔ یہ بل پارلیمنٹ میں ۵/مئی کو پیش ہوا تھا اور ۶/مئی کی درمیانی شب میں منظور ہوا تھا۔ حضرت مولاناؒ نے لکھا ہے:

”۵/اور ۶/مئی کی درمیانی شب مسلمانوں کے لیے عجیب رات تھی۔ کتنے مسلمانوں نے رات جاگتے اور دعا کرتے گذاری، گھروں میں دعائیں ہو رہی تھیں اور ختم پڑھے جا رہے تھے۔“

(أیضاً: ۱۴۱/۳)

بالآخر کئی گھنٹوں کی مسلسل بحث کے بعد اور مسلم قائدین اور پورے مسلم سماج کی انتھک جدوجہد کے نتیجہ میں رات کے پونے تین بجے یہ تاریخی بل پارلیمنٹ میں منظور ہوا اور اس طرح ایک سیکولر ملک میں اقلیتی فرقہ کو اپنے تحفظ کا یقین ہوا اور مسلم قائدین پر ہندوستانی مسلمانوں کے اعتزاز وافتخار میں اضافہ ہوا۔ بلا شبہ یہ تاریخ ساز اور سنگین مسئلہ حضرت مولاناؒ کے عہد صدارت کا ایک جلی عنوان ہے۔

حضرت مولاناؒ کی سرپرستی میں گرچہ بورڈ اور ملت اسلامیہ ہندیہ نے یہ ایک بڑی کامیابی حاصل کی تھی مگر حضرت مولاناؒ اس کو جزوی اور محدود کامیابی سمجھتے تھے، اس لیے کہ ان کی نگاہیں یہ دیکھ رہی تھیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کے سروں پر یکساں سول کوڈ کا خطرہ منڈلا رہا ہے جس کے بعد یہ بل بھی کالعدم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مولاناؒ اپنے خطبات میں اور ہر سطح پر مسلمانوں کو یکساں سول کوڈ کی سنگینی اور اس کے خطرات سے آگاہ کرتے رہے اور ملک کے قائدین کو بھی اس کے بھیانک نتائج سے متنبہ کرتے رہے۔

۱۹۹۰ء میں جب بعض ممبران پارلیمنٹ کے بیانات سے یہ خطرہ محسوس ہوا کہ ہندوستان میں یونیفارم سول کوڈ کے نفاذ کی کوشش زور پکڑ سکتی ہے اور مسلمانوں کا پرسنل لا ایک بار پھر خطرہ میں پڑ سکتا ہے تو حضرت مولاناؒ نے اس موقع پر وزیر اعظم ہند وی پی سنگھ کو ایک مکتوب روانہ کیا جس میں انہیں مخلصانہ مشورے دیے اور بطور خاص مسلمانوں کے پرسنل لا کے تحفظ کو یقینی بنانے کی بات کہی۔ اسی کے معاً بعد جب اراکین بورڈ کو یہ احساس ہوا کہ ایک وفد وزیر اعظم سے مل کر عام مسلمانوں کے جذبات وخیالات اور شکوک وشبہات بیان کردے تو اس موقع پر حضرت مولاناؒ کی سربراہی میں ایک وفد نے وزیر اعظم ہند وی پی سنگھ سے ملاقات کی۔ حضرت مولاناؒ کی یہ ملاقات بڑی مفید ثابت ہوئی جس کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ جناب وی پی سنگھ نے اخیر میں یقین دہانی کے بطور یہ کہا کہ

”مسلم پرسنل لا میں (حکومت کا) کسی مداخلت کا ارادہ نہیں ہے اور یونیفارم سول کوڈ کو مختلف فرقوں اور اقلیتوں پر تھوپا نہیں جائے گا۔“

(أیضاً: ۲۱۱/۴)

اسی طرح ۱۹۹۵ء میں جب سپریم کورٹ کے ایک بیانیہ سے یکساں سول کوڈ کا خطرہ دوبارہ لاحق ہوا تب بھی آپ نے غیر معمولی سعی پیہم کی۔ میڈیا میں جرأت مندانہ بیانات دیے اور ذمہ داران حکومت سے ملاقات کر کے بالآخر ہندوستانی مسلمانوں کو تحفظ بخشا۔

جس زمانہ میں نفقہ مطلقہ کا مسئلہ ہندوستان کے سیاسی اُفق پر چھایا ہوا تھا، اسی دوران بابری مسجد کا مسئلہ بھی موضوع بحث بن چکا تھا۔ اس سلسلہ میں بھی حکومتی ذمہ داران سے ملاقات کے وقت حضرت مولاناؒ نے کھل کر گفتگو کی اور انہیں اس موضوع کو دبا دینے کا مشورہ دیا مگر شر پسند عناصر نے ایسی تجاویز کو خاطر خواہ اہمیت نہ دی۔

بابری مسجد کا قضیہ جب زیادہ الجھا تو متفقہ طور پر حضرت مولاناؒ کا نام ثالثی کا کردار ادا کرنے کے لیے پیش کیا گیا۔ حضرت مولاناؒ کا اس پورے قضیہ میں ایک ہی نظریہ تھا جس کو ذمہ داران نے تسلیم بھی کیا تھا اور وہ نظریہ یہ تھا کہ

(۱) مسجد خالص ہندو مذہبی پیشواؤں کی تولیت میں نہ دی جائے۔

(۲) حکومت اس کے تحفظ کی ذمہ داری لے۔

بابری مسجد ہی کے قضیہ میں ماہِ اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ایک وفد کے ساتھ حضرت مولاناؒ کی وزیر اعظم ہند سے ملاقات ہوئی جس میں ہر قیمت پر ملک کے اندر امن وامان باقی رکھنے کی بات کو یقینی بنایا گیا تھا مگر بعد میں پتہ چلا کہ انہوں نے مسجد کو سرکاری ملکیت میں لینے اور اس مسئلہ کو سپریم کورٹ کے حوالہ کرنے کی بات کہی ہے تو مولاناؒ نے اخبارات میں اپنا نیا بیان جاری کیا اور بڑی جرأت سے وزیر اعظم کے موقف سے عدم حمایت کا اعلان کیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ

''بعد میں معلوم کر کے سب کو اطمینان ومسرت ہوئی کہ صدارتی آرڈیننس واپس لے لیا گیا اور اس سے جو پیچیدگی اور خطرات پیدا ہوئے تھے وہ فوری اور ظاہری طور پر رفع ہو گئے۔''

(أیضاً:۴/۳۵۴)

لیکن بابری مسجد کے قضیہ میں سو فیصد کامیابی کے عدم حصول کی ایک بڑی اور بنیادی وجہ بتاتے ہوئے حضرت مولاناؒ لکھتے ہیں:

''یہ مسئلہ ایسا آسان، سادہ اور سہل العمل نہیں رہا۔ اس کے ساتھ مختلف جماعتوں اور تنظیموں کی دلچسپیاں، قائدانہ مفادات اور مستقبل کی عزت وشہرت کے جذبات وابستہ ہیں۔'' (۴/۳۷۸)

مگر اس کے باوجود وقتاً فوقتاً اس مسئلہ میں حضرت مولاناؒ کی شخصیت ثالثی کا کردار ادا کرتی رہی۔ ۱۹۹۲ء میں جب یہ مسئلہ گرم تھا تو ازخود وزیر اعظم نرسمہا راؤ جی نے ایک خط لکھ کر ملاقات کی خواہش ظاہر کی، تا کہ اس مسئلہ کا کوئی حل ممکن ہو سکے۔ اس کے بعد ارکان بورڈ کا ایک وفد تشکیل پایا اور حضرت مولاناؒ نے اس کی بہترین نمائندگی کی۔

حضرت مولاناؒ نے حکیمانہ اسلوب سے گفتگو کا یوں آغاز کیا کہ

''ہندوستان کی آزادی کی بعد پہلی مرتبہ جنوبی ہند کی ایک شخصیت کا وزارتِ عظمٰی کے لیے انتخاب کیا گیا ہے۔ جنوب اپنی رواداری اور تعصّبات سے دوری میں ابھی تک نیک نام اور ممتاز رہا ہے، توقع کی جاتی ہے کہ آپ اس وسیع القلبی اور وسیع النظری سے اس مسئلہ کا حل تلاش کریں گے۔'' (أیضاً:۵/۱۰۶)

حضرت مولاناؒ نے اپنے عہد صدارت میں بورڈ کی ترقی واستحکام کے لیے بھی بہت سے مفید کام انجام دیے مثلاً: بابری مسجد کے مسئلہ میں غور وخوض اور جدوجہد کے لیے ''بابری مسجد بازیابی کمیٹی'' تشکیل دی اور اس کو اپنے میدان میں بورڈ کے نظریات پر قائم رہتے ہوئے آزادانہ کام کرنے کا مکلّف بنایا۔ اس کے علاوہ بورڈ کے تحت ''اصلاحِ معاشرہ'' کی کمیٹیاں بنوائیں اور مرکزی قانونی جائزہ کمیٹی کے تحت صوبائی کمیٹیوں کو تشکیل دیا۔ ان کمیٹیوں کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ ایسے مختلف قوانین اور فیصلوں پر نظر رکھیں گی جن سے پرسنل لا میں مداخلت ہو رہی ہو۔ علاوہ ازیں مسلمانوں میں بورڈ کے افکار ونظریات کی تشہیر کے لیے لٹریچر کی اشاعت کی گئی اور بالخصوص ''مجموعہ قوانین اسلامی'' کی ترتیب وتدوین کا کام بھی حضرت مولاناؒ ہی کے عہد صدارت میں انجام پایا، جس کے اندر تمام اسلامی دفعات کو سہل اسلوب میں مدوّن کیا گیا ہے۔

اخلاص کیا ہے؟

داعی اسلام حضرت مولانا سید عبداللہ حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ

''اللہ تبارک وتعالیٰ کی عبادت اور اطاعت میں مشغول رہنا اس طور پر کہ اس کی رضا ہی مطلوب ہو۔کوئی اور غرض' کوئی اور مقصد نہ ہو۔آدمی جو کام بھی کرے وہ اس لیے کرے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ راضی ہو جائے' اسی کا نام ''اخلاص'' ہے اور یہ زندگی کے ہر گوشے سے تعلق رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ ہم نے تم کو عبادت کے لیے پیدا کیا ہے اور یہ حکم ہے کہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔معلوم ہوا کہ ہماری زندگی میں دو چیزیں ہیں؛ ایک عبادت اور دوسری اطاعت۔عبادت میں بھی اللہ کی رضا مقصود ہو اور اطاعت میں بھی اللہ کی رضا مقصود ہو؛

﴿وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ فَازَ فَوْزاً عَظِيماً﴾

(جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرے گا وہی سب سے زیادہ کامیاب ہے۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا تعلق زندگی کے ہر گوشے سے ہے۔جب آدمی صبح کو بیدار ہوتا ہے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرتا ہے۔اس اعتبار سے کہ آپ کیا کرتے تھے؟ یہ اطاعت ہے کہ آپ کی زبان مبارک پر کون سے الفاظ آتے تھے اور اس کے بعد آپ کے معمولات کیا تھے؟ اس کے مطابق اپنا وقت گزارا جائے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا حقوق بیان فرمائے ہیں؟ ماں باپ کے حقوق کیا ہیں؟ اور جو احسان کرنے والے حضرات ہیں مثلاً؛ استاد ہے آپ کو صحیح راہ دکھانے والا ہے، صحیح رہنمائی کرنے والا ہے، اس کا احسان آپ کس طرح چکائیں، اس کے ساتھ کیا معاملہ کریں؟ یہ ساری چیزیں اطاعت میں شامل ہیں۔اس طرح اگر آپ دیکھیں گے تو زندگی کا ہر گوشہ اور زندگی کا ہر لمحہ اس میں شامل ہے اور دونوں میں، ہی مقصود یہ ہے کہ اللہ کی رضا اور خوشنودی حاصل ہو جائے' جو کام بھی کیا جائے اللہ کو راضی کرنے کے لیے کیا جائے اور یہی اصل چیز ہے۔''

(اخلاص اور اس کے برکات وثمرات:۸-۹)

R.N.I. No.
UPURD/2009/28748

Monthly
Payam-e-Arafat
Raebareli

Volume: 15 ⚜ September 2023 ⚜ Issue: 09

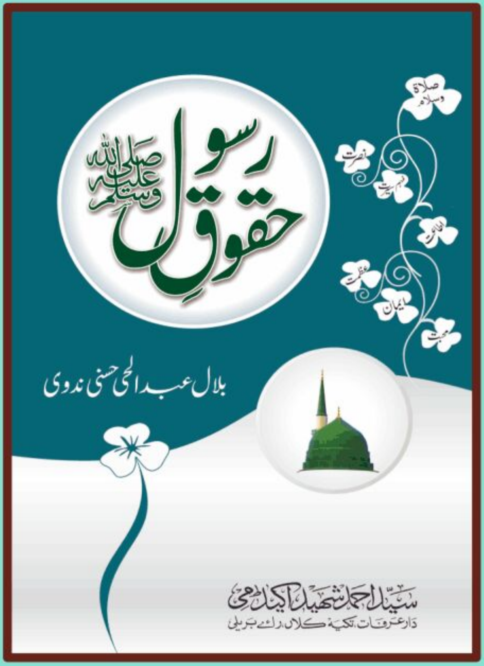

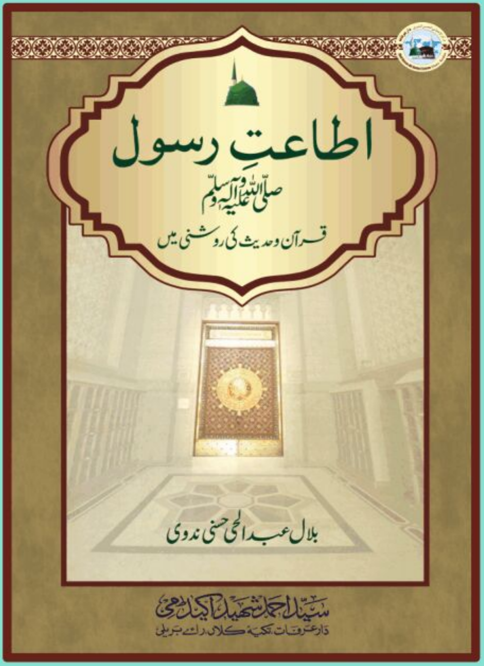

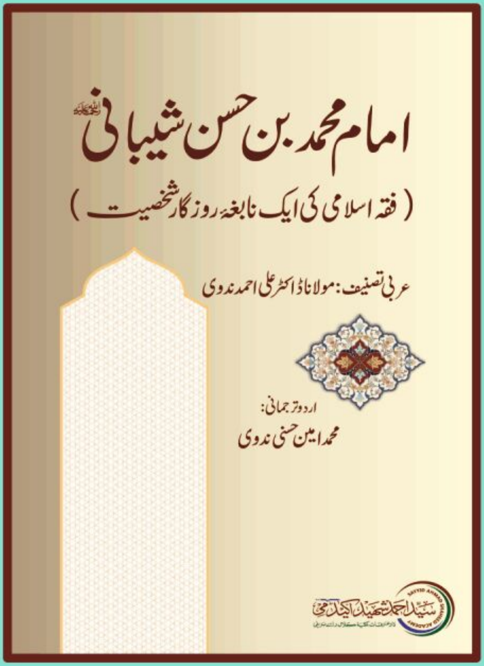

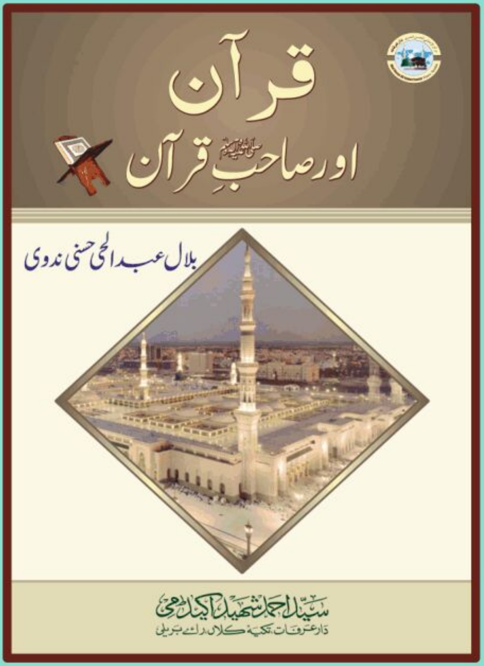

Editor: Bilal Abdul Hai Hasani Nadwi
MARKAZUL IMAM ABIL HASAN AL-NADWI
E-Mail: markazulimam@gmail.com - Dare Arafat, Takiya Kalan, Raebareli (U.P.) 229001 - Mobile: 9792646858
Printed & Published by: Mohammad Hasan Nadwi, On Behalf of Markazul Imam Abil Hasan Al-Nadwi.
Printed at S.A. Offset Printers, masjid ke Peeche, Phatak Abdullah Khan, Sabzi Mandi, Station Road, Raebareli (U.P.)